Acc No.
10018

اشکِ آتش

شوکت واسطی

عظیم پبلشنگ ھاؤس پشاور

GOVT. URDU LIBRARY
ACC. No. 10018
Date 23.12.87
PATNA

رائیٹرز گلڈ شاخ کوہاٹ

کی

پہلی پیش کش

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

G. U. L. Patna.
گورنمنٹ اردو لائبریری
پٹنہ
۱۹۳۸ء

اشک آتش

برِ صغیر ہندوستان کی تقسیم کا

تاریخی تجزیہ

و

تحریک پاکستان کا مذہبی، اقتصادی اور معاشری
پس منظر

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اَمْوَاتًا ط بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ
يُرْزَقُوْنَ ہ

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے۔ ان کو مردہ
مت خیال کر، بلکہ وہ زندہ ہیں،
اپنے پروردگار کے مقرب ہیں،
ان کو رزق بھی ملتا ہے۔

آل عمران

(۱۶۹)

انتساب

پیارے بھائی

عظمت واسطی کے نام

کرنال ضلع مسلم لیگ
کے سیکرٹری جو
قیامِ پاکستان
کے وقت
نواحِ تھانیسر میں شہید کر دیئے گئے

اے ایمان والو! اپنے سوا کسی کو صاحبِ خصوصیت
مت بناؤ۔ وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد
کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے،
تمہاری مضرت کی تمنّا رکھتے ہیں۔
واقعی بغض ان کے منہ سے ظاہر
ہو پڑتا ہے۔ اور جس قدر
ان کے دلوں میں ہے وہ تو
بہت کچھ ہے۔ہم علامات
تمہارے سامنے ظاہر
کر چکے اگر تم عقل
رکھتے ہو
آل
عمران
(۱۱۸)

سوانح

نام :- صلاح الدین شوکت واسطی

تلمیذ :- ابو البیان عبد الحمید عدم

پتہ :- پرنسپل گورنمنٹ کالج پارا چنار (کرم ایجنسی)

وطن :- شاہ آباد (ضلع کرنال)

گارڈن کالج راولپنڈی سے بی اے آنرز، اور ایڈورڈز کالج پشاور سے ایم اے کے امتحانات دیئے۔ ۱۹۴۸ء میں محکمہ تعلیم پشاور سے منسلک ہوا۔ اور ایبٹ آباد، مردان، کوہاٹ میں تعینات رہا، اب دو سال سے پارا چنار میں مقیم ہوں،

اردو سبھا اور اردو مرکز (پشاور)، بزمِ علم وفن (ایبٹ آباد، پشاور، کوہاٹ و پارا چنار) سے متعلق رہا۔ سابق صوبہ سرحد میں اپنی بساط کے مطابق ترویج اردو کے لیے مساعی کی۔ ماہنامہ "نوبہار" کے نام سے ایک مجلّہ بھی پشاور سے جاری کیا۔ گیتوں کا ایک مجموعہ "جل ترنگ" قیامِ پاکستان سے پہلے طبع ہوا تھا۔

سابق صوبہ سرحد میں کافی دوست اور دشمن موجود ہیں۔

تعارف

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ شوکت کہ در زمانہ تست

مشہور فرانسیسی نقاد "سنت بو" کے نظریۂ تنقید میں شعر فہمی کے لیے شاعر شناسی کا عنصر جزءِ لاینفک کا حکم رکھتا ہے۔ مجھے "سنت بو" سے اتفاق بھی ہے اور اختلاف بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک رسمی اور روایاتی شاعری کا تعلق ہے، شاعر کی شخصیت اور اس کے کلام کے محرکات و عوامل کی اہمیت کو نظر انداز کر دینے سے چنداں قباحت لازم نہیں آتی، البتہ جس شاعری کی بنیاد حکمت و حقیقت پر ہو، اس کے افہام و تفہیم میں شاعر کا ذہنی و قلبی جائزہ اور اس کے کلام کے پسِ منظر کا بہ نظرِ امعان مطالعہ ازبس ناگزیر ہو جاتا ہے۔ نظمِ زیرِ غور کی نوعیت ایسی ہی ہے۔ کہ نہ صرف شاعر کے احساسات، نظریات، رجحانات، خلوص، دیانت اور صداقت غور طلب ہیں، بلکہ ماضی و حال کے آئینہ میں استقبال کی جو جھلک پیش کی گئی ہے، اس کی تنقیح بھی ضروری ہے۔

شوکت واسطی صاحب کو میں ایک عرصہ سے جانتا پہچانتا ہوں، ان کا کلام بھی میرے لیے نیا نہیں۔ یوں تو انہوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر غزل گوئی میں ان کا انداز منفرد ہے۔ وہ باغ و بہار آدمی ہیں، ان کی سنجیدہ ظرافت، پر ظرافت سنجیدگی، مزاح، طنز

خلوص، ہمدردی، معاملہ فہمی، وسعتِ قلب و نظر ان سب خوبیوں نے بہتوں کو ان کا گرویدہ کر رکھا ہے۔ ان کا حلقۂ احباب ناقابلِ قبول حد تک متنوّع ہے۔ ان کی غزلیں ایک شاد کام اور بامراد عاشق کے جذبات کی ترجمان ہیں، جن میں حسنِ الفاظ، طرزِ ادا اور واقعیت نگاری نے جان سی ڈال دی ہے۔ محبوب کی آنکھوں اور زلفوں نے ان کے گرد ایک حصار سا قائم کیا ہوا ہے۔ جن سے ان کا کلام آب و رنگ اکتساب کرتا ہے۔ وہ حسنِ انسانی کو معراجِ حسن سمجھ کر تشبیہوں کے قائل نہیں، کیونکہ بقول ان کے

رنگ ہے اس میں مگر وہ زندگی کا رس کہاں
لوگ یوں تشبیہ دیتے ہیں لبوں کو جام سے

ان کے یہاں کہیں کہیں حسرت بھی پائی جاتی ہے، مگر وہ رسمی درو اباتی نہیں، بلکہ ذاتی و خصوصی ہے۔ یہ ناکردہ گناہوں کی حسرت ہے۔ اس کیفیت کا مظہر دیکھیئے۔ کہتے ہیں:

ہر بات زندگی میں بڑی دیر سے ہوئی
منزل پہ آلئے تو ہمیں ہمسفر ملے

غرضیکہ شوکت اور ان کا کلام میرے لیے نیا نہ تھا، مگر گذشتہ ماہ انہیں کے یہاں ایک مختصر سی ادبی صحبت تھی، اس میں ان کی اس بے بدل نظم کے چند اشعار سن کر میں چونک اٹھا، یہ چیزے دیگر تھی۔ یہ باغ و بہار شوکت کا کلام نہ تھا، یہ ایک دکھے دل کی

پکار تھی، یہ ایک بالغ نظر محبِ وطن کی للکار تھی، یہ نظم داد طلب نہ تھی، غور طلب تھی، یہ نوائے جلترنگ نہ تھی، نہیبِ لہو ترنگ تھی۔ چند روز کے بعد رائٹرز گلڈ نے شوکت واسطی کے ساتھ ایک شام "منانے کا پروگرام بنایا۔ اس میں اس نظم کے مزید اشعار سُنے اور حیران رہ گیا۔ اتنا خشک موضوع اور تمام ادبی رعنائیاں لئے ہوئے اور رعنائیوں کے جلو میں تحسین تازیانہ بھی۔ نظم میں اس دریا جیسا بہاؤ تھا جو ہموار سطح پر نرم رفتاری سے بہتا ہے۔ مگر چٹانوں سے ٹکرا کر تلاطم برپا کر دیتا ہے۔ ہزاروں سال کی تاریخ معدودے چند اشعار میں یوں سموئی ہوئی ہے جیسے واقعی کسی دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہو پھر تاریخی واقعات پر تحقیقی نظر، متنازع فیہ امور پر محققانہ محاکمہ اسباب و علل کے سلسلہ کی گرہ کشائی، تاریخی شخصیات کا روپ اور ان کا قومی زندگی پر اثر، اس پر طرّہ ایک سچے محبِ وطن کے دردمندانہ جذبات۔ کان سن رہے تھے اور آنکھوں کے سامنے تاریخ کے دفتر کے دفتر الٹ رہے تھے۔ یہ الفنسٹن[1] اور کے[2]

---

[1] الفنسٹن۔ سابق گورنر بمبئی جس نے اپنی ضخیم تاریخ ہند میں مسلمانوں اور مسلمان بادشاہوں کے خلاف زہر افشانی کی ہے۔

[2] Kay جس نے Sepoy Mutiny (سپاہیوں کی بغاوت) کے نام سے تین جلدوں میں ۱۸۵۷ء کے واقعات انگریزوں کے نقطۂ نظر سے پیش کئے ہیں۔

کی تردید ہے ، یہ ہنٹر[۳] اور تھامپسن[۴] کی تائید ہے۔ یہ مکالے[۵] کا جواب ہے یہ صرف ایک شاعر کا کلام نہ تھا۔ اس میں فلسفی کا تفکر، مصور کا موقلم، مورخ کی نگاہ اور ملت پرست کا دل مل جل کر عجیب کیفیات پیدا کر رہے تھے۔ ایوب صاحب نے جو اسٹیج سکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے یا خود عزیز اختر وارثی صاحب سیکرٹری رائٹرز گلڈ شاخ کوہاٹ نے مجھ سے کہا کہ اس نظم کے متعلق اپنے تاثرات حاضرین کے سامنے پیش کروں۔ میں ہنوز اپنے حواس مجتمع نہ کر پایا تھا۔ مگر از راہ امتثالِ امر کچھ کہنا پڑا، جواب یاد نہیں۔

"تقسیمِ ہند" - یہ کم و بیش پان سو ابیات کی ایک مسلسل نظم ہے جس کا موضوع تو تقسیم ہند ہے۔ مگر بہ طور پس منظر ہندوستان کی پوری تاریخ انتہائی اختصار مگر بڑی جامعیت کے ساتھ اس میں سموئی ہے ان تحریکات، واقعات اور شخصیات کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا ہے جن کا

---

[۳] ہنٹر، جس کی کتاب (Our Indian Muslims) مشہور ہے جس میں اس نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں کی حالتِ زار کا بڑا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔

[۴] تھامپسن، جس نے On the other side of the Medal کے نام سے ۱۸۵۷ء کے انقلاب پر غیر جانبدارانہ محاکمہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

[۵] لارڈ مکالے، وہ متعصب انگریز اہلِ قلم جس نے اپنے تاریخی مضمون "کلائیو" میں دعویٰ کیا ہے کہ مغلوں کی حکومت اپنے دورِ عروج میں بھی یورپ کی بدترین ریاست سے بدتر تھی۔

تعلق براہِ راست تقسیم ہند سے ہے۔ بابر کے جانشینوں کی بالعموم اور اکبر کی بالخصوص ناعاقبت اندیشانہ رواداری، اورنگ زیب کی حقیقت بینی، کمتر درجہ کے تیموری تاجداروں کی خانہ جنگی اور سہل انگاری، خود کام امرا کی غداری، بن بلائے مہمانوں کی حد سے بڑھی ہوئی امنگیں اور ریشہ دوانیاں، ابنائے وطن کا تعصب، عیاریاں اور بے وفائیاں، ان جملہ عوامل کے اثرات و نتائج، بھگتی کی مسلم دشمن تحریک، سرفروش مجاہدوں کے لازوال کارنامے اور ان کا حسرتناک انجام، ان تمام حالات و واقعات کو نہایت صحت اور تحقیق کے ساتھ انتہائی دلنشین انداز میں پیش کیا ہے۔ تاریخی شخصیتوں کے اصلی روپ کو چچے تلے الفاظ میں دکھایا ہے۔ سید احمد شہید بریلوی اور سر سید احمد خان کی تصاویر نہایت نمایاں اور موثر ہیں۔ محض چند الفاظ میں ان کی شخصیتوں کی عظمت کا سکہ دلوں پر بٹھایا ہے۔ سر سید کے لیے کہتے ہیں :

سید احمد خان نگاہِ دیدۂ بینائے قوم
بہر تشخیصِ مرض، وہ بوعلی سینائے قوم

پہلا مصرع حالی مرحوم کا ہے اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کا مصرعِ ثانی کا منتظر تھا جو تقریباً پچھتر سال کے بعد شوکت واسطی نے اس پر لگا دیا ہے۔ حیات جاوید کے ہیرو کی شخصیت تنگ نظر مسلمانوں میں بدقسمتی سے آج بھی متنازع فیہ ہے۔ مگر جن لوگوں نے اس زعیم ملت کی تحریروں اور کارناموں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کے قول و فعل کو آنے والے زمانے کے واقعات سے ملا کر جانچا اور پرکھا ہے۔

وہ جانتے ہیں کہ اس کے دل میں احیائے ملّت کی کیسی تڑپ اور لگن تھی اور اس کی نظر میں مستقبل بعید کا کتنا صحیح اندازہ کر رہی تھیں۔ راجہ شیو پرشاد کی اردو دشمن اور ہندو نواز تحریک سے انیسویں صدی کے ربع ثالث ہی میں اس کا ماتھا ٹھنکا تھا اور اس نے لندن سے نواب محسن الملک کو صاف صاف لکھ بھیجا تھا کہ ابنائے وطن کی نیت صاف معلوم نہیں ہوتی اور ان کا ہمارے ساتھ مل جل کر رہنا امر محال معلوم ہوتا ہے۔ پھر وائسرائے کی مجلسِ انتظامیہ میں غالباً ۱۸۸۳ء میں اس نے واشگاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ حکومت خود اختیاری کی حالت میں جماعت قلیل سراسر خسارے میں رہے گی بشرطیکہ اس کے تحفظات کا سامان نہ کر لیا گیا۔ ہیوم کی بنائی ہوئی انڈین نیشنل کانگرس سے مسلمانوں کی علیحدگی کا مشورہ اس کی اعلیٰ درجہ کی پیش بینی پر مبنی تھا۔ غرضیکہ موجودہ دور کا مورخ اس کی سیاسی سوجھ بوجھ کا بدرجۂ اتم قائل ہے۔ سر سید کی تحریک احیائے ملّت کا ایک زبردست آرگن حالی کی شاعری تھا۔ اور مسدس مدّ و جزر اسلام اردو شاعری میں اور مسلمانوں کی قومی زندگی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں مولانا شبلی اور ڈاکٹر نذیر احمد نے بھی مقتضائے وقت کے مطابق نظمیں کہیں، خاص طور پر مولانا شبلی نے بہت پر جوش نظمیں کہیں۔ مگر مسدس حالی کی حیثیت اور اس کا درجہ منفرد ہے۔ مسدس کے بعد اقبال کے ترانے (پہلے وطنی اور پھر ملّی) اور نظمیں (شکوہ اور جواب شکوہ علی الخصوص جواب شکوہ) قوم کی گرتی ہوئی حالت کی آئینہ دار ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے مشرق بیزاری

اور مغرب پرستی کے خلاف منظوم آواز اٹھائی اور اظہارِ خیالات کے لیے ظرافت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ کیونکہ اس زمانے میں یہاں بات پر زبان کٹتی تھی۔ شوکت کی نظم ملت پرستانہ جذبات کے اظہار کے سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ اردو شاعری پر عدم مقصدیت اور وطنی ملی جذبات کے فقدان کا جو الزام لگایا جاتا ہے۔ اور ہماری شاعری کو ہماری زندگی سے بے تعلقی کا جو طعنہ دیا جاتا ہے۔ یہ نظم اس کا بھرپور جواب ہے۔ یہ نہ صرف ہماری قومی و ملی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ بلکہ ہماری اس زندگی کی بقاو بہبود کا راستہ بھی سجھاتی ہے۔ تقسیم ہند کے قبل، دوران اور بعد فرقہ وارانہ فسادات مسلمانانِ ہند و پاک کے لیے زبردست المیہ ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں کسی ملک نے اپنی آزادی کے لیے اتنی عظیم قربانیاں پیش نہیں کیں۔ ایک مخلص محبِ ملت کے احساسات کی ترجمانی جس حسن و خوبی اور خلوص و دیانت سے شوکت نے کی ہے اردو زبان کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس میں حکمت اور سوز کے امتزاج کا لطف نقطۂ عروج تک پہنچا ہوا ہے۔ جن لوگوں کی نظر سے شیخ سعدی کا مشہورِ عالم مرثیہ "زوال بغداد"[ا] ...

ا؎ ۱۲۵۸ء میں مغلوں نے آخری خلیفہ بغداد اور اس کے خاندان کو ہلاک کر کے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ سعدی نے اس واقعہ ہائلہ سے متاثر ہو کر جو مرثیہ لکھا، اس کا مطلع یہ ہے :-

آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنیں

اور انوری کا لازوال قصیدہ "اشکہائے خراسان" گذرا ہے وہ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ شوکت نے پہلے ۱۸۵۷ء کے خونین انقلاب کا مؤثر انداز میں ذکر کرکے اس انقلاب کے بعد مسلمانوں کی پستی اور زبون حالی کا عبرت انگیز مرقع پیش کرکے، پھر ۱۹۴۷ء کے خونچکاں المیہ کی جو عکاسی کی ہے، اس کا ادب میں کیا مقام متعین کیا جا سکتا ہے۔ ناز و نعم کے گہواروں میں پلے ہوئے افراد کی بے کسی، مظلومیت اور بے سرو سامانی کے نقشے انوری اور شوکت دونوں نے پیش کئے ہیں۔ ان کے قریب قریب متحد المعنیٰ اشعار کا جائزہ دلچسپی اور افادیت سے خالی نہ ہوگا:-

انوری:-

رحم کن رحم برآں قوم کہ جوبندہ جویں
از پس آنکہ نخوردندے از ناز شکر

شوکت:-

سربلند اب کفش بردار اور کوچہ روب تھے
جن کی پلکوں پر جگہ تھی چشم کا آشوب تھے

انوری:-

ہر کہ پائی دخرے داشت بحیلہ بگریخت
چہ میکند مسکیں آں را کہ نہ پائے است نہ خر

شوکت:-

بے سرو ساماں، برہنہ پا، اجڑتے روپ میں
کالے کوسوں پاپیادہ، بارش آندھی دھوپ میں

کارواں در کارواں پنجاب اور بنگال سے
کیا کیس پہنچے وطن میں بے وطن کس حال سے

نظم کا آخری شعر ساری نظم کی جان ہے۔ انتقام کا نعرہ کوئی کھوکھلا سیاسی نعرہ نہیں ہے بلکہ ایک گھمبیر خطرے کے پیش نظر نہایت اہم پیغام ہے۔ اگر قوم نے بر وقت اس زندہ خطرے کی شدت کا کماحقہٗ احساس نہ کیا اور اس پیغام کو اپنانے میں پہلو تہی یا سہل انگاری سے کام لیا تو خاکم بدہن اس کے خورشید اقبال کے زرد ہونے کے امکانات بعید متصور نہ کئے جائیں۔ ہندو استعماریت کا عفریت اپنی تمام عیاریوں اور ستمگاریوں سے لیس آمادۂ فساد ہے۔ ہندو مت کی تاریخ، اس کا فلسفہ، اس کا ادب اس امر کا گواہ ہے کہ جنگ میں وہ کسی حیلہ یا ظلم سے دریغ نہیں کرتا۔ کوٹل[۱] کا ارتھ شاستر میکیاولی[۲] کے پرنس کا نقش اول ہے۔ خود ان کی مذہبی کتابیں ان کی گھناؤنی ذہنیت کی آئینہ دار ہیں۔ مہابھارت کے ایک ایسے ہی ناپاک واقعہ کی طرف شوکت نے اشارہ کرکے ابنائے ملت کی غیرت کو جھنجھوڑا ہے ؏

دروپدی ننگی تھی اور کورو مناتے تھے جشن

---

[۱] راج نیتی یعنی سیاسی حکمت عملی پر چندر گپت موریہ کے وزیر اپ گپت یا چانکیہ کی مشہور کتاب جس میں مکر و حیلہ کو حکومت کے لیے جائز قرار دیا گیا ہے۔

[۲] میکیاولی، اطالیہ کا مشہور عملی سیاسی مفکر، جو ریاست کے لیے جبر و فریب کی ضرورت کا پرچار کرتا ہے۔

غرضیکہ ہر دیال[1] اسکیم سے لے کر نہرو انی عزائم تک ہندوؤں نے سیاست میں جو بھی قدم اٹھایا ہے اس میں در پردہ مسلمانوں پر تسلط اور غلبہ کا جذبہ کار فرما ہے۔ اور اس تقسیم کے بعد تو وہ کھل کر میدان میں آگیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ نظم نہ صرف پاکستان کے بچہ بچہ کی زبان پر ہو، بلکہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے پاکستان کے مسلمان اس حقیقت کو فراموش نہ کریں کہ ان کا بدترین دشمن جو بدقسمتی سے ان کا پڑوسی بھی ہے، ہر وقت موقع کی تاک میں ہے۔ اور اپنی حفاظت سے ہرگز غافل نہ رہیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ساری ملت کے اتحاد کی ضرورت ہے۔ حکومت کو چاہیئے کہ ریڈیو سے کم از کم ہر ہفتہ اس کے اقتباسات نشر کئے جائیں۔ مشاعروں اور عام و خاص محافل میں لوگ ایک دوسرے کو اس کے اشعار پڑھ کر سنائیں۔ مخیر حضرات اس کے اعلیٰ اڈیشن چھپوا کر مفت لوگوں میں تقسیم کریں، کالجوں میں اس کو لازمی نصاب میں شامل کیا جائے غرضیکہ ہر محبِ ملت اس کی نشر و اشاعت کو ایک قومی فریضہ سمجھے۔

اس نظم کی افادی حیثیت کے علاوہ اس کے ادبی

---

[1] ایک انتہائی متعصب ہندو جس نے ایک خفیہ منصوبے کے ذریعہ تمام ہندوستان پر ہندو غلبہ کے علاوہ، افغانستان، ایران کو غلامی کی بدترین زنجیروں میں جکڑنے کا خواب دیکھا تھا۔

محاسن بھی بے شمار ہیں، جن کا مختصراً ذکر نہ کرنا بے انصافی کے مترادف ہوگا۔ اس کا ایک نمایاں وصف مناسب بحر کا انتخاب ہے۔ یہ بحر نہ اتنی مختصر ہے۔ کہ ادائے مفہوم میں دِقت ہو، نہ اتنی طویل کہ مسلسل سننے میں طبیعت پر بار ہو، کہیں کہیں مشہور شعراء کے مصرعے بعینہٖ چسپاں کر دیئے، کہیں تصحیف و تغیر کر کے عالمِ گوناگوں پیدا کیا گیا ہے۔ ہندی، فارسی، اردو اور عربی کے مصرعے اور اشعار ایسے باموقع اور برمحل صرف کئے گئے ہیں کہ باید و شاید۔ انتخاب اشعار میں انہوں نے جس سلیقہ اور چابکدستی سے کام لیا ہے۔ وہ لائق ستائش ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں بھی یہی سلیقہ مندی کار فرما ہے۔ کہیں ہندی شبدوں سے مفہوم اجاگر کیا ہے۔ کہیں خوش نما فارسی تراکیب سے مطلب کو سجایا ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ شتر گربگی کا مطلق احساس نہیں ہوتا بلکہ ہندی اردو کا یہ سنجوگ صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے کلام کو زیادہ خوشں آئند معنی خیز اور پُر تاثیر بنا دیتا ہے۔ بھگتی تحریک کے لیے کہتے ہیں:

شاطرانہ اک عجب تحریک کا چرچا کیا
گیان اور کرما کو دے کر روپ بھگتی مارگ کا

اور پھر

دین فطرت پر بڑھا کر لوندسی ویدانت کی
بھگت اب تلقین کرتے تھے نرالی شانت کی

جگہ جگہ ضرب الامثال، محاورے، تلمیحیں، اور کہاوتیں ایسی برمحل

اور باموقع ستعمال کی گئی ہیں، جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا ہو۔ تشبیہوں اور استعاروں کا مصرف محض آرائش کے لیے نہیں بلکہ زورِ کلام کو بڑھانے اور مطالب کو ذہن نشین کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ کوئی صنعت حکمت سے خالی نہیں اور حکمت ہر جگہ سوز و ساز سے ہم آہنگ ہے۔ الفاظ و معنی میں پورا اتحاد ہے۔ جو بات جس طرح کہنا چاہیے، اسی طرح کہی گئی ہے۔ نہ ایجاز مخل ہے نہ اطناب ممل۔ نہ معنی کے جسم پر الفاظ کی قبا تنگی کرتی ہے، نہ مضامین کے تسلسل میں کہیں جھول نظر آتا ہے، حشو و زوائد نہ ہونے کے برابر ہیں۔ غرضیکہ از ابتدا تا انتہا نظم کی سادہ پرکاری اور پرکار سادگی، توازن، تناسب، معنی آفرینی اور اثر انگیزی برابر قائم رہتی ہے۔ شاعر نے جا بجا خوش چینی بلکہ نکتہ آفرینی سے حسنِ ادا کے جوہر دکھائے ہیں۔ کہیں کہیں اقتباس و تضمین سے حسنِ کلام اور زورِ بیان میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

آخر میں دو نظمیں۔ پشاور اور ٹیکسلا بطورِ ضمیمہ اس میں شامل ہیں لیکن بغور دیکھا جائے تو یہ نظمیں بھی اصل موضوع سے بالکل مختلف نہیں ہیں "پشاور" ایک تاریخی نظم ہے، جس میں مسلمانوں کی فتوحات کی داستانیں پیش کر کے، موجودہ ترقی پر روشنی ڈال کر، موجودہ مستقبل کے امکانات کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ "ٹیکسلا" بھی تاریخی نظم ہے۔ اس کے دامن میں جو تہذیبی اور ثقافتی جواہر پارے بکھرے پڑے ہیں۔ اس میں شوکت شاعر اور شوکت مورخ ایکدوسرے

سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ گنبد حار آرٹ کی فن کارانہ اور مؤرخانہ تفسیر کا یہ ایک بیش قیمت خزانہ ہے۔ جدید دور میں اس علاقہ کی ترقی جسن ابدال اور واہ کے ادارے تعمیر انسانی کے تسلسل کی تفسیر ہیں۔ اور اس طرح ماضی اور حال کے ڈانڈے یہاں آ کر مل جاتے ہیں۔ جیسا کہ خود فرماتے ہیں :-

ایک ہی ٹہنی کے ہیں دو پھول ماضی اور حال
بسکہ ہم رشتہ ہیں ایامِ ترقی و زوال

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، یہ اصل نظم اور ضمیموں کا محض اجمالی خاکہ ہے اور سب کچھ لکھنے کے بعد مجھ کو اس امر کا بہ شدت احساس ہے کہ میں شاعر اور نظم کے ساتھ انصاف نہ کر سکا۔ مدلّل مداحی کے الزام سے بچنے کے لیے میں نے حتی الامکان جادۂ اعتدال سے متجاوز نہ ہونے کی کوشش میں اپنے قلم کو جو مائل بہ تفریط رکھا ہے۔ یہی اس تبصرے کی خامی ہے۔ اربابِ ذوق خود پڑھ کر محسوس کریں گے کہ یہ بات کس حد تک صداقت پر مبنی ہے :-

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

رضا

کوہاٹ
فروری ۱۹۶۳ء۔

شوکت واسطی کے ساتھ ایک شام

میونسپل لائبریری کوہاٹ

میں منعقد ہوئی

۲۵ جنوری

سنہ ۱۹۶۳ء

جب نظم "تقسیمِ ہند" پیش کی گئی۔

:- پروگرام :-

۱۔ پیغامات .... فارغ بخاری

محسن احسان

۲۔ خاکہ .... ایوب صابر

۳۔ تقریر .... اشرف بخاری

۴۔ نظمیں .... غلام حیدر اختر

شجاعت علی راہی

عزیز اختر وارثی

۵۔ نظم تقسیم ہند .... شوکت واسطی

۶۔ تقسیم ہند پر تبصرہ .... اشرف بخاری

وصی رضا

اہتمام

پاکستان رائٹرز گلڈ (شاخ کوہاٹ)

ایک شام

رپورتاژ

شوکت واسطی صاحب کے ہاں ایک غیر رسمی بزم مشاعرہ منعقد تھی۔ ان کی یہ فرمائش "کہ آج نظمیں ہونگی"، خاصا چونکا دینے والی تھی۔ کیونکہ اب تک جہاں ان حضرت کو دیکھا غزل بسر دیکھا تھا، غزل کا مداح، تغزل پر جان دینے والا۔ خیر نظمیں ہونے لگیں۔ شوکت صاحب کی باری آئی تو کہنے لگے، ایک طویل نظم "تقسیم ہند" کے عنوان سے کہی ہے۔ اس کا ایک حصہ سماعت کریں۔ فسادات کے متعلق چند اشعار انہوں نے پیش کئے اور محفل برخاست ہوگئی۔

اگلے روز رائٹرز گلڈ شاخ کوہاٹ نے فیصلہ کیا کہ اس نظم کو فوراً عوام کے سامنے لایا جائے۔ ۲۵ جنوری ۶۳ء کو شام چار بجے جناح میونسپل لائبریری ہال میں ایک عام جلسہ کا اعلان کردیا گیا۔ گلڈ کوہاٹ کے اراکین نے رنگ رنگ کے پروگرام منانے کا جو سلسلہ شروع کیا ہوا تھا، یہ شام اس کی ایک اہم کڑی تھی۔ جب اجلاس کا آغاز ہوا اور میں نے نشستوں پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا تھا جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔

اجلاس کی کاروائی کا آغاز جناب الحاج غلام حیدر اختر نے تلاوتِ قرآن پاک سے کیا۔ ازاں بعد میر مجلس حضرت شوکت واسطی نے گلڈ کے اراکین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:-

"مجھے یہ جان کر صدمہ ہوا کہ گلڈ کے اراکین میرے ساتھ ایک شام منا کر لوگوں کو میرے فن اور شخصیت سے متعارف کرانا چاہتے ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ کم از کم کوہاٹ میں تو میں خاصا جانا پہچانا ہوں۔ بہر حال دوستوں کے اصرار پر میرا تسلیم خم ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان مہربانوں نے مجھے اپنے بارے میں اظہارِ خیال سے روک دیا ہے۔ یہ سنائیں گے، مجھے سننا ہوگا۔ اس کی یہ افادیت میرے لیے کیا کم ہوگی کہ میں اپنے بارے میں بے لاگ رائے سے آگاہ ہو جاؤں گا اور اپنی کوتاہیو اور اپنے فن کی خامیوں پر نظرِ ثانی کر سکوں گا۔"

میرِ مجلس کی تقریر کے بعد میں نے حضرت فارغ بخاری کا پیغام پڑھ کر سنایا جو اس تقریب کے لیے بھیجا گیا تھا — "شوکت واسطی کے ساتھ شام منانے کے سلسلہ میں آپ سے گلہ ہے۔ آپ نے پہلے سے مطلع نہیں کیا۔ میری انتہائی خواہش تھی کہ میں اس تقریب میں شامل ہوتا۔ اور کچھ لکھتا لیکن اب اتنا تنگ وقت ہے اور کچھ لکھنا ممکن نہیں بس اس لیے شمولیت کرنا بھی بیکار ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ لوگوں نے جلد بازی سے کام لیا ورنہ اطمینان سے یہ پروگرام ہوتا تو زیادہ کامیاب ہوسکتا تھا۔ اب میں مضمون تو ضرور لکھوں گا، لیکن چند دن لگیں گے۔"

اسی نوع کا ایک وعدہ محسن احسان صاحب سے بھی موصول ہوا تھا چند دن کے بعد واقعی یہ مضامین مل گئے اور دیگر روداد کے ساتھ روزنامہ "بانگِ حرم" پشاور کے ادبی و علمی حصے میں طبع ہوئے۔

پیغامات کے بعد راقم الحروف نے شوکت واسطی پر اپنا خاکہ سنایا جو بڑا سراہا گیا۔ پھر غلام حیدر اور اشرف بخاری نے تقریریں کیں۔ یہ خاکہ اور تقاریر، کوہاٹ گلڈ کی دیگر سرگرمیوں کے تفصیلی جائزے کے ساتھ کتابی صورت میں، اس ادارے کی آئندہ سالگرہ کے موقع پر ہدیۂ قارئین کی جائیں گی۔

غلام حیدر اختر نے کہا "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ایوب صابر کوزے میں دریا بند کرنے پر قادر ہیں تو میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔ اب حیران ہوں کہ کیا کہوں کیونکہ کوئی بات بھی تو ایسی نہیں جو اس بندۂ خدا نے نہ کہی ہو۔ تاہم ازرہ امتثالِ امر کچھ کہنا بھی ضرور ہے، سو عرض ہے کہ شوکت صاحب سے میرے مراسم گزشتہ بیس برس سے چلے آتے ہیں۔ بیس برس تک دوستی نبھانا شوکت صاحب ہی کا کام ہے۔ شوکت شاعر بھی ہیں، ادیب بھی اور تاریخ کے استاد بھی، مگر مجھے ان کی انسانیت سب سے زیادہ پسند ہے، ان کا حسنِ سلوک ہر شخص کو ان کا گرویدہ بنا دیتا ہے"۔ اشرف بخاری نے شوکت صاحب کی شاعری میں صنفِ غزل پر اظہارِ خیالات کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اونچی شاعری جب ہوگی غزل کی ہوگی، ہمارا کلچر غزل کا کلچر ہے، ہماری تہذیب غزل کی تہذیب ہے۔ ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ واسطی کا فن دامانِ ابدیت سے ہم کنار ہے۔ ان کی تقریر کے بعد شجاعت علی راہی، عزیز اختر وارثی

اور غلام حیدر اختر نے شوکت صاحب کی شخصیت اور شاعری کے متعلق قابل قدر اشعار پیش کیئے۔

جب شوکت واسطی صاحب نے اپنی طویل نظم "تقسیم ہند" کے جستہ جستہ اشعار پیش کیئے تو ایسا محسوس ہوا کہ ماحول یکسر دیگر ہو گیا۔ کوئی دل ہو گا جس نے ان شعروں کا گہرا اثر قبول نہ کیا ہو، حاضرین نے جی کھول کے داد دی۔ الحاج غلام حیدر اختر مدیر ہفت روزہ "ہمدم" نے اس نظم کو اپنے خرچ پر کتابی صورت میں شائع کرنے کی پیش کش کی اور خیال ظاہر کیا کہ یہ کتاب منصۂ شہود پر آئی تو ضرور تہلکہ مچا دے گی۔ جناب عزیز اختر وارثی، سیکرٹری رائٹرز گلڈ شاخ کوہاٹ نے غلام حیدر صاحب کے اس جذبہ کی تعریف کرتے ہوئے انہیں مطلع کیا کہ گلڈ اس کتاب کو اپنے زیر اہتمام طبع کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

اشرف بخاری نے اس نظم پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا۔

"یہ نظم شاہنامۂ اسلام سے کم نہیں۔ جو بحر واسطی صاحب نے منتخب کی ہے۔ وہ کامیاب ہے۔ ان خیالات کے اظہار کے لیے اس سے اچھی بحر منتخب ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ نظم کی کامیابی کی ایک وجہ یہ ہے کہ واسطی صاحب صرف شاعر ہی نہیں ہیں مورخ بھی ہیں۔ ان کی یہ تخلیق ژرف نگاہی کا بین ثبوت ہے۔ انہوں نے بھگتی تحریک کا ذکر جس انداز میں کیا ہے، وہاں بڑے

بڑے عالم ڈگمگائے ہیں۔ حیرت ہے شوکت صاحب نہیں ڈگمگائے"

سید وصی رضا نے نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا :-

" واسطی صاحب کی یہ نظم جب سے سنی ہے تبھی سے دل میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ اب انہوں نے اپنا صحیح منصب پا لیا ہے۔ مانا کہ شاہ نامۂ اسلام میں حفیظ کا موضوع بہت اونچا ہے لیکن واسطی صاحب کی یہ تخلیق بھی ایک مورخ، ایک ادیب اور ایک دردمند انسان کے خیالات کی آئینہ بردار ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے دردمند دل، علم اور وسعت نظر چاہیئے۔

گلڈ کے دیگر اراکین کی خاص استدعا پر پروفیسر وصی رضا صاحب نے مکمل نظم کے لیے تفصیلی تعارف لکھنا قبول کیا، جو اس کتاب میں شامل ہے۔

ایوب صابر

کوہاٹ

فروری ۱۹۷۳ء

تقسیمِ ہند

کشورِ ہندوستان دراصل ہے برِّ صغیر
اپنی کثرت میں وحید اور اپنی وحدت میں کثیر

سرزمینِ سیم و زر افشاں، بنی آدم نواز
ہے امینِ صد روایت، مامنِ صد امتیاز

ہے یہ دہلیزِ تمدن، شہ نشینِ اعتقاد
کتنے دینوں کا حرم، کتنے سماجوں کا سواد

سرحدوں میں فاصلہ باہم ہزاروں میل کا
ہے فراہم نو بہ نو موضوع قال و قیل کا

منفصل تاریخ اس کی منتشر جغرافیہ
اک غزل جس کے نہیں دو شعر بھی ہم قافیہ

التزامِ آب و گل، کیفیتِ آب و ہوا
مختلف ماحول تا ماحول، دیگر جا بہ جا

وصفِ گوناگوں سے فطرت مستقل معجز نما
پھل کی خاصیت جدا ہے، پھول کی رنگت جدا

دور تک میدان، چٹیل سنگریزے، دھول، ریت
دور تک نعمات زا پھلواریاں، زرخیز کھیت

ہے کہیں حدِّ نظر تک ایک ویرانہ سپاٹ
دور تک آدم نہ آدم زاد پیدا، گھر نہ گھاٹ

ہے کہیں آباد تا حدِّ افق غدّار شہر
جس میں دائم دید نی ہے زندگی کی لہر بہر

ہیں یہاں کھڈ کھائیاں بے تہ، وہاں اونچے پہاڑ
یہ گھنے گنجان جنگل، وہ ترائی بھر اجاڑ

کوئی خطہ وہ نہ ہو معلوم دریاؤں کی تھاہ
منطقہ کوئی کہ قطرے کو ترستی ہے نگاہ

ایک طبقہ ہیں نظر پرور نظاروں کا ہجوم
اک علاقہ مستقل ویرانیوں کی مرز بوم

جا بہ جا جیسے ممیز اصل خاک و باد کی
ہیئت ایسے مختلف افراد سے افراد کی

ہیں تفاوت میں نمایاں قامت و قد، خال و خد
ابیضؔ و اصفرؔ تھے اُن کے۔ ان کے اسمرؔ اسودؔ و جد

رنگ کے سو عکس چہروں پر، کئی جسموں پہ روپ
ان سے کھِل جاتے ہیں سائے۔ ان سے بجھ جاتی ہے دھوپ

مرحلہ در مرحلہ ہے سلسلہ وار ارتقا
ڈھونڈھیے تو ابتدائی آدمی مل جائے گا

اختلافِ نسل ہی پر فاصلہ موقوف کیا
مختلف ان کے قرین مجہول کیا معروف کیا

ط: انسان کی چار بڑی نسلیں مخصوص ہیں۔ اسود (سیاہ فام، حبشی)، ابیض (سفید فام، ارمنی)، اصفر (زرد فام، منگول)، اسمر (گندم گوں، سامی)

ہیں بہم فکر و نظر میں دوریاں آفاق کی
زاویہ دیں کا جدا، قدریں الگ اخلاق کی

بُعد باشندوں میں واضح مجلسی تنظیم کا
وہ اُخوّت کیش ہے، یہ مدّعی تقسیم کا

مختلف اقسام ملبوسات و انواع طعام
ناروا اُن کا روا اِن کو، حلال اُن کو حرام

فرق طرزِ بود و باش آئینۂ فرقِ مزاج
مشترک تہوار ہے کوئی، نہ ہے یکساں رواج

طبع میں شیتل یہ جمنا سا، وہ ایمن سوز برق
بھر بکے جھنتی ہیں جیسے غرب و شرق شرق

اس عقیدے اور اس کرتوّیہ[۲] میں امتیاز
شبھ شرادھ[۳] اپنا ہے، اپنا مسلک نذر و نیاز

ھ۲ : فرض ھ۳ : مردوں پر چڑھاوا چڑھانا،

پاٹ پوجا، گیان دھیان، اپرادھ گن، پن پاپ الگ
آتما پرماتما نروان دھن جپ جا پ الگ

ذکر و فکر و وِرد و عرفان و عبادت مختلف
فرض، سنت، مستحب، عصیاں، سعادت مختلف

ہے سورگ اور نرک، فردوس و جہنم میں تضاد
دیوتاؤں سے نہیں، ان کو فرشتوں سے عناد

اور ہے پرلوک، دارِ جاودانی اور ہے
آخرت کی آرزوے زندگانی اور ہے

کب میسر ایک سا ان کو بصیرا نہ جمال
باب میں خلاق ہستی کے نہیں یہ ہم خیال

ایک کا معبود واحد، ایک کے لاکھوں صنم
دور ہے کیلاش و کاشی سے کہیں بیت الحرم

۴: گناہ، ۵: نجات ۶: وظیفہ و تسبیح

موت پر بھی اس کی مٹی ہے تو اس کے آگ ہے
اپنی اپنی ڈفلیاں ہیں، اپنا اپنا راگ ہے

نسل انسانی کا بھارت اک عجائب خانہ ہے
آدمی سے آدمی سو رنگ میں بیگانہ ہے

کرۂ بے زرع ذی تھا غیر رنگ و نوردشت (۱)
"ہیچ عالم جز ہیولیٰ قابل صورت نہ گشت

آدمی ہم پیش ازاں کادم بوَد بوزینہ بود"
خاکداں میں کب اسی صورت ہوا اس کا ورود

جب ہیولوں کا ورا و ماورا گہوارہ تھا،
آسماں کو یاد ہوگا جو یہاں نظارہ تھا،

کیا سماں تھا نیست میں ہستی کی جد و جہد کا
بسکہ افسانہ ہے مبہم آدمی کے مہد کا

---

۱ : بیدل کا شعر ہے۔

ذہن تک اس عہد کی پہنچی بڑی مدہم لکیر
ہے یہ نکتہ آج بھی تحقیق کا منت پذیر

کب ہوا منظر کوئی اک خوش نما ارمان کا
کب قدم دنیا میں آیا اولیں انسان کا

آفرینش۔ آدم و حوّا کا فطری اقتصار
یا زمانہ در زمانہ سلسلہ وار ارتقار

ہوتا ہے تشریف فرما مدّعائے کائنات
ارض پر معراج تک آخر پہنچتی ہے حیات

باہمہ وسعت زمیں لیکن قبائے تنگ ہے
اشرف المخلوق، مخلوقِ دگر پہ دنگ ہے

مختصر قامت ہے، کوتہ بازو و کوتاہ پا
ہر قدم اس کے مقابل اک قوی ہیکل بلا

صوتِ بے معنی، نوائے بے سرود و چنگ ہے
گرد و پیشِ آدمی بے التزام رنگ ہے

داستانِ ہند بھی اک سازِ بے آہنگ ہے
یہ زماں اندر زماں دورِ صوّان[۸] و سنگ ہے

آدمی غاروں کا باشی، پھول پتوں کا چرند
کھال میں ملبوس، آوارہ کنارِ گنگ و سند

کول[۹]، بھومیجی، سرک، سنتھال، کڈ، منڈا و بھیل
جھرکھنڈہ[۱۰] میں کھن گتی[۱۱] ہانِوڑ کا نظم ہم قبیل

کیا خبر کتنے زمانوں تک رہے آباد یہ
کیا خبر کیسے مٹے، کیسے ہوئے برباد یہ

---

[۸] ایک سخت قسم کا پتھر جس سے ابتدائی ہندی باشندے اوزار وغیرہ بناتے تھے۔

[۹]: کول بھیل قبائل کی ذیلی شاخیں، [۱۰]: وسطِ ہند کا پرانا نام،

[۱۱]: ہم مل جل کر رہنے کی تنظیم،

ختم پھر عہدِ حجر، عہدِ فلز آغاز تھا
جست و مس سے آدمی ہر سو ہنر پرداز تھا

تھے نئی تہذیب کے بانی دراوڑ اور گونڈ
ان کے آثار اب ہڑاپہ و موہن دارو میں ڈھونڈ

زندگی بابل، ٹرائے، کریٹ کی ہم چشم تھی
دل تعلق راں، طبیعت غیر سے بے خشم تھی

لیکن ان کی بزم ہستی مثلِ نقشِ آب تھی
یہ توقف جس قدر بھی تھا حقیقت خواب تھی

دم زدن میں حرزِ ماضی یہ زمانہ ہو گیا
واقعہ تحقیق سے پہلے فسانہ ہو گیا

سلسلہ در سلسلہ وارد ہوئے جب آریا
لے گیا سب ایک ریلے میں بہا سیلِ فنا

اب ہویدا مطلعِ تاریخ پر عہدِ جدید
ارتقا کی آدمی کے ہاتھ آتی ہے کلید

عام کر کے رسم بھارت ورش میں تخریب کی
آریوں نے نیو رکھی اِک نئی تہذیب کی

یہ نئی تہذیب ویدوں سے جنم لیتی ہوئی
دیش کو فکر و نظر کا اور ڈھب دیتی ہوئی

آریہ سجدہ کنانِ فطرتِ مظہر نما
آگ، پانی، چاند، سورج، آسماں سب دیوتا

دیوتاؤں کو عطا کرتے ہوئے رنگ و بدن
دم بہ دم بڑھتا ہوا ان کی صنم سازی کا فن

دیکھتے ہی دیکھتے برہما کے جلوے کھو گئے
رفتہ رفتہ یہ پرستارانِ ہر شے ہو گئے

کالے گورے آریہ اَن آریہ ہیں بٹ گئے
یہ اخوت کی حسیں ہموار رہ سے ہٹ گئے

برہمن کھتری سے اعلیٰ اور کھتری ویش سے
اور یہ تینوں معلّیٰ شودرِ بے کیش سے

پہلے ہی ان کے خداؤں کا کچھ اندازہ نہ تھا
بن گیا اب آدمی بھی آدمی کا دیوتا

تھا روا چنڈال سے ظلم و اہانت کا سلوک
ہو منش کے جون میں جیسے کوئی مردود خوک

یہ نیا مت دین نہ تھا اک مجلسی تنظیم تھی
سینکڑوں ورنوں[12] میں اونچی جات کی تقسیم تھی

یہ سماج اولادِ آدم کے لیے سفاک تھا
اس میں جنتا سے الگ ہر آدمی ناپاک تھا

---

[12]: طبقے، درجے

دھرم ہو گر ناش اوروں کا تو اس کو چین تھا
ہر ملیچھ[13] کو ضم کرے خود میں یہ نصب العین تھا

حملہ آور آریوں کے بعد بھی آتے رہے
ہند پر مانند ابرِ بیکراں چھاتے رہے

لیکن اس دیوارِ آہن سے جو ٹکرائے نہ تھے
یہ ہوا عالم کہ بیچارے کبھی آئے نہ تھے

فاتحانہ آئے لیکن ہو گئے مفتوح سب
بے نظر، بے آرزو، بے زندگی بے روح سب

اک سمندر تھا یہ، جس میں ہر ندی ملتی رہی
اک گلستاں جس کی خاطر ہر کلی کھلتی رہی

کس نے توڑا "چتر[14] ورن" کا حصارِ آہنین
کب ہوا تسخیر اجنتا[15] کا یہ حسنِ حسین

ح۱۳: نجس، ان کے نزدیک ہر غیر ہندو ناپاک تھا ح۱۴: چار طبقے ح۱۵: برہمن، شتری، ویش، شودر، ان میں اچھوت شامل نہیں

رہ سکے زندہ نہ ایرانی نہ یونانی یہاں
ہو گئی بے کار دونوں کی ہمہ دانی یہاں

پارتھی، ہُن، پہلوا، شک، بختری تھے پاکستان
رہ گیا تاریخ کے اوراق میں ان کا نشان

تھا یہ وہ کانٹا کہیں جس کا کوئی دارو نہ تھا
کوئی منتر توڑ ہو جس کا یہ وہ جادو نہ تھا

مل کے اس مت میں بنی ہر قوم اسی کی ایک ذات
کھا گیا سارے ملیچھوں کو "نظامِ ذات پات"

(۲)

ہو گئی روشن جبینِ کائناتِ ہست و بود
جب ہوا دینِ براہیمؑ و محمدؐ کا ورود

ہو گیا واضح حقیقی آفرینش کا نظام
ہو گیا الحاد، یہ ضِلِّ بنِ ضِلّ، تمام

خالقِ ارض و سما سے خلق کا رشتہ ملا
ذہن و دل سے چھٹ گیا سحرِ خدانِ باطلہ

ہو گیا روشن نظر پر "باعث لیل[16] و نہار"
چھن گیا اب آدمی سے آدمی کا اختیار

ہو گئی اک "کلّ اِخوۃ" کی نئی تنظیم عام
آدمیت کا ربوبیت کے بعد آیا مقام

ہو گیا دنیا پہ سرِّ عظمتِ تخلیق فاش
ڈھے گئی دیوارِ رنگ و نسل ہو کر پاش پاش

روز پیدائش نہ کوئی کہتر و بالا بنا
اب عمل بہرِ تمیزِ اسفل و اعلیٰ بنا

ختم محتاج و غنی، آقا و مولا کی تمیز
ہو گئے فرہاد و یوسف مثل پرویز و عزیز

---

[16] : ربِّ حقیقی،

بہر ابنائے حمیرؔ[۱۵] و معد ہی کب امرِ اصدع[۱۶]
تھی رضا ہو آلِ آدم واقفِ نقصان و نفع

عام ہو اسلام کا پیغام یہ مقصود تھا
ہر جگہ پہنچے خدا کا نام یہ مقصود تھا

میر تھے خیر البشرؐ اور کارواں خیر الاُمم
چار سو لہرایا توحید و اخوت کا علَم

وادیٔ بطحا سے ہوتا ہے ظہورِ نورِ تام
السّلام اے ہادیؐ و سالارؐ کامل السّلام

ذہن کو عرفان کے سانچے میں ڈھالا جائیگا
آدمی قعرِ مذلت سے نکالا جائے گا

۱۵: آل حمیر و آل معد، جنوبی اور شمالی عرب قبیلے ۱۶: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ؛ غرض آپ کو جس بات کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کو صاف صاف سنا دیجیے، اور مشرکین کی پروا نہ کیجیے الحجر (۹۲) ۱۴،

جب اٹھے توحید لاکھوں کے مقابل ڈٹ گئے
جب بڑھے تو کوہ و قلزم راستوں سے ہٹ گئے

یہ حیاتِ جاوداں کے ذوق میں مرتے ہوئے
کفر و گمراہی کی ظلمت کو فرو کرتے ہوئے

نور پھیلاتے ہوئے ایمان کی قندیل سے
آمو[ض۱۹] و سیر کے سواحل تک کنارِ نیل سے

عام ہو جاتی ہے آخر حمدِ ربُّ العٰلمین
مغرب الاقصا و اُندلس سے بجدِّ و ختن[ض۲۰] و چین

آئے لے کر بادۂ توحید سے مخمور رند
ابن قاسم، غزنوی، غوری بسوئے سندھ و ہند

فاتحانِ ہند — غالب غازیانِ ذی وقار
چاٹتی ہے آب تلواروں کی صدیوں کا غبار

[ض۱۹]: جیحون اور سیحون دریا [ض۲۰] وسطِ ایشیا میں ہے۔

تھا عمل شانہ بہ شانہ فتح و استحکام کا
رفتہ رفتہ ہند میں غلبہ ہوا اسلام کا

دیکھتے ہیں ٹوٹتا نقدیرِ ہندی کا جمود
البریؔ[۲۱] و خلجی و تغلق سلاطین کے عہود

تاجدارانِ کشادہ قلب و عالی حوصلہ
بند فرماتے ہوئے حکمت سے بابِ ہر گلہ

محض دامن گیر بہبودِ رعایا کا خیال
مسلم و ہندو برابر شادماں، آسودہ حال

فرض سلطانی تھا محکوموں کی تالیفِ قلوب
منصبِ شاہی رعایا کی خبرگیری ہو خوب

ملک کے ہر مسئلہ سے آشنا رہتے تھے وہ
قوم کے ہر درد میں شامل سدا رہتے تھے وہ

---

۲۱ : خاندانِ غلامان کے اکثر سلطان البری ترک تھے۔

گرچہ اقلیت میں تھے کثرت سے حیرانی نہ تھی
سرپرستی کے سوا اِن کی جہاں بانی نہ تھی

ملک میں ہر مذہب و ملت کے لوگ آباد تھے
زیرِ ظلِ اللہ خوش تھے، مطمئن تھے شاد تھے

عدل پیشہ، نیک دل، فرخ طبیعت خوش نہاد
حکم قانون ایک بہر عام و خاص و شاہزاد

بہرِ ہر مذہب رواداری، تحمل کا سلوک
تاکہ ذہن و دل سے زائل ہوں تکدر اور شکوک

اتحاد و آشتی کے سو جتن ہوتے رہے
دور تر لیکن بہم اہلِ وطن ہوتے رہے

جس قدر اس کی طرف دستِ محبت تھا دراز
تھا کشیدہ اور بھی محمود سے جیسے ایاز

کوئی بھی اخلاص تخمِ آرزو کی کاشت کا
کر سکا پیدا نہ عالم باہمی برداشت کا

ہر روا دارِ اعتنا سے روح کو پرہیز تھا
ہر تعاون سے گریزِ قلبِ کم آمیز تھا

مخلصانہ قرب میں حائل تھا نظمِ ذات پات
تھا ملیچھ مسلم، منو شاستر[۲۲] ملیچھ سے چھوت چھات

خواہ مسلم، خواہ یوچی[۲۳]، ہن، دراوڑ، بھیل کول
دھرم ہوتا ہے ادھرم ان سے اگر ہو میل جول

گر نہ برہمن اور گنگو پوجا انہیں منظور ہو
جو ملے ان سے وہ جنتا کا بڑا مقہور ہو

تھی ہمیشہ کی طرح اب بھی یہی جنتا کی گھات
کیجئے جس طور بھی کعبے پہ حاوی سومنات

ح۲۲: منو کا دھرم شاستر جو ذات پات کی اساس ہے ح۲۳: مشہور کشان قبیلہ ان کی نسل سے تھا، ح۲۴ ہند قوم،

ست کیجئے جسز و دبستانِ من و تو کیجئے
حسب سابق دار دانِ نو کو ہندو کیجئے

شاطرانہ اک عجب تحریک کا چرچا کیا
گیان[25] اور کرما[26] کو دے کر ردیپ بھگتی[27] مارگ کا

دینِ فطرت پر بڑھا کر لوندسی ویدانت[28] کی
بھگت اب تلقین کرتے تھے نرالی شانت کی

اپنے ڈھب میں ڈھال کر اسلام کی باتیں کئی
دھرم گیتا خلطِ کذب و صدق کی بر لب نئی

تھی کتر بیونت حدِّ خوب و نامسعود میں
مسلک اصلِ شہود و شاہد و مشہود میں

ح۲۵ : نجات بذریعہ علم ح۲۶ : نجات بذریعہ عمل ح۲۷ : نجات بذریعہ معرفت باطن ح۲۸ فلسفہ ویدانت : تتوومسی (तत्त्वमसि) یعنی وہ تو ہے ، ہمہ اوست کے مماثل ہے۔

یہ مرکب اعتقادات معاد[۲۹] و دہر کا
عام تھا بنگال و پنجاب و دکن میں جابجا

مذہب اسلام و ہندو مت برائے یک پیام
با مسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام

کعبہ و کیلاش[۳۰]، پوران[۳۱] و قرآں، رام و رحیم
ایک سورج کی شعاعیں، ایک گلشن کی نسیم

یہ بزعم خویش سدِ باب آویزش کیے
نصِ قرآنی[۳۲] میں پد[۳۳] ویدوں کے آمیزش کیے

منتخب دینِ متیں سے کر کے تعلیمات چند
برج بھاشاؤں میں فرماتے ہوئے ترجیع بند

ح۲۹ : دنیا اور آخرت سے مراد ہے۔ ح۳۰ کیلاش پربت جو دیوتاؤں کا مسکن ہے۔ ح۳۱ : ہنود کی قدیم تاریخی کتب،
ح۳۲ : آیات، ح۳۳ : بول،

رام[۳۴] نج چیتانیہ، ولبھ اچاری، رام نند
مدعی تھے ہو براہِ ویدا انساں ارجمند

تھے اسی بانی کے پرچارک گورو نانک کبیر
کچھ بصیرت سے پرانی ہی اجالی تھی لکیر

"آرسی ہردے میں ہے مکھ میت کا دیکھا نہ جائے
مکھ تبھی دیکھے جو تو درشن[۳۵] کی اے مورکھ مٹائے

نین کی کر کوٹھری پتلی پلنگ اس میں بچھائے
ڈار[۳۶] کر پلکوں کی چق[۳۷] کوئی پیا جی کو رجھائے

جیوں تلوں میں تیل کی دھارا، جیوں چقمک میں آگ
ہے ترا پیتم تجھی میں جاگ سکتا ہے تو جاگ

جات مت سادھو کی پوچھیں، پوچھیے آپ اس کا گیان
مول کرنا ہے کرو تلوار کا چھوڑو میان"

۳۴ بارھویں سے پندرھویں صدی عیسوی تک بنگال و دکن میں بھگتی تحریک کے سربراہ تھے۔ ۳۵: میل، گرد، ۳۶: ڈال کر، ۳۷: چق ۳۸: چقماق،

سن کے سیدھی دل میں جو اترے وہ بولی عام کی
شامل رنگ سخن تھی بوئے خوش اسلام کی

دور سے تھے بھگت پنتھی مستفیض اس دین سے
مدعا ثابت ہے بھگتی مارگ کی تلقین سے

مدح خوان مے تھے لیکن میگساروں میں نہ تھے
یہ ثنا خوان نظر شامل نظاروں میں نہ تھے

تھے گلستاں میں ہوائے سیر گل رکھتے نہ تھے
تھے خمستاں میں دماغ جام و مل رکھتے نہ تھے

تھی تمنائے ضیا اور ماہ و انجم سے گریز
آرزوئے امن، لیکن اپنے باطن سے ستیز

حسن ترتیل اور معانی آفرینی اور ہے
خوشہ ہو جانا دگر ہے، خوشہ چینی اور ہے

رہگذر پر بیٹھ کر منزل نمائی سہل ہے
بادیہ پیمائیٔ مشکل، لب کشائی سہل ہے

یہ مساعی تھی دلوں پر سحرِ بنگالہ چلے
جام میخانے سے نکلے، باغ سے لالہ چلے

رائیگاں جاتی نہیں جیسی بھی ہو ایجادِ طبع
ہو گئی حسبِ زمانہ کچھ نہ کچھ اُفتادِ طبع

چند شاہانِ تلون طبع کو گذرا خیال
قومِ یک فکر و نظر بہرِ وطن اک نیک فال

عامۃ الناس[۲۹] آپ اگر کم ہیں علیٰ دینِ ملوک
کیجئے رائج نیا میزانِ احسان و سلوک

از رہِ حکمت سیاست پر ہو ملت کی اساس
گر رعایا کو نہیں رسم و رہِ شاہاں کا پاس

ص۲۹ : اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِہِمْ،

حسبِ توفیقِ خرد جاری کیا تدبیر کو
ایک [41] نے دینِ الٰہی، اک [42] نے ستیہ پیر کو

کیا محل ہے سعیِ مہمل کی کسی تفسیر کا
"بدعا [43] عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا"

ہر غلط اقدام از روئے شریعت اتحاد
عالمانِ سوءِ دربار اس پہ فرماتے تھے صاد

کتمِ حقِ شرعِ زمانہ تھی، زمیں بوسی نماز
مہرِ شہ، خوشنودیِ بوالفضل و فیضیِ کارساز

تھے چہار ارکانِ دینِ شاہ بہرِ خاص و عام
ترکِ [44] دین و ترکِ جان و ترکِ مال و ترکِ نام

---

[41] اکبر بادشاہ [42] حسین شاہ والئ بنگال نے جاری کیا، معنی سچا مرشد، [44]: مراتب چارگانہ اخلاص دینِ الٰہی میں شرکت کے لیے قبول کرنا ضروری تھے اقرار نامہ یہ تھا "منکہ فلاں ابن فلاں باشم بطوع و رغبت و شوقِ قلبی از دینِ مجازی و تقلیدی کہ از پدران دیدہ و شنیدہ بودم، ابراء و تبرا نمودم و در دینِ الٰہی اکبرشاہی آمدم مراتب چہارگانہ اخلاص کہ ترکِ مال و جان و ناموس و دین باشد قبول نمودم۔

شاہ کو تھا راست پردازی پہ اس درجہ یقین
مسخِ دیں کو جانتا تھا افضلِ دینِ مبین

اس روش میں اس قدر مستغنیٔ اندازِ بیت
"شاہ امسال دعوائے نبوت کردہ است"

وہ تجاوز تھا کہ ہر سو مشتہر تخمینِ ظن
"گر خدا خواہد دگر سالے خدا خواہد شدن"

کس قدر خوش فہم، کتنا کامیابی پر یقین
کہتے تھے ہمعصر[1] "ہندو می زند شمشیرِ دیں"

دیکھتے تھے شاہ و دربار ایسی قومیت کا خواب
مسلم و ہندو ہمیشہ ہم شعار و ہم نصاب

ہم دلی کے زعم میں پایدگر عقد اور بیاہ
ہمسری کے وہم میں ہم منصبی، ہم عزّ و جاہ

---

[1] ملا شکیبی کا شعر ہے: چناں در عہدِ او احوال دیدم کہ ہندو می زند شمشیرِ اسلام

ناظم و بخشی بھی ہندو، صوبہ و دیوان بھی
میر و سالارِ عساکر بر سرِ میدان بھی

راجپوت اب ہوں مغل مشہور اس دھن میں بھی تھے
میرزا ہم[۴۵] میں تھے گر تو میرزا ان میں بھی تھے

کون شہزادہ کسی رانی کا ماں جایا[۴۶] نہ تھا
فرطِ خوشنودی کا یہ عالم کبھی آیا نہ تھا

ہائے لیکن جگت[۴۷] گورو تھا یا مہا[۴۸] اتّم بلی
آرزوئے انس بنجر خانۂ دل میں پلی

خوبصورت تھا اگرچہ خواب، بے تعبیر تھا
باعث غارت گری ہنگامۂ تعمیر تھا

ح ۴۵ : مرزا راجہ مان سنگھ، مرزا راجہ جے سنگھ، مرزا راجہ جسونت سنگھ مشہور راجپوت امرا تھے۔ ح ۴۶ : مسلمان بادشاہ رانیوں کے "راکھی بند" بھائی بننے اور اس رشتہ کو نبھانے میں بڑے سرگرم تھے۔ ح ۴۷ ابراہیم عادل شاہ والئی بیجاپور جو ہند نوازی کے سبب بڑا مشہور تھا اور اس کا یہ لقب پڑ گیا تھا۔ ح ۴۸ مہابلی، اکبر کا لقب تھا۔

جس قدر بڑھتے تھے آگے فاصلہ بڑھتا تھا اور
رنگ جتنا کاٹتے جاتے تھے یہ چڑھتا تھا اور

شیوۂ پرہیز ہی شیوہ رہا اغیار کا
کر سکا مائل نہ کوئی بھی سلوک ایثار کا

ایسے عالم میں ظہور اک مرد با تدبیر کا
بادشاہِ آخر اورنگ زیب عالمگیر کا

جس کی تھی جذبات سے بڑھ کر حقیقت پر نگاہ
خوب منزل آشکارا، مستقیم و صاف راہ

ناگوار اس کی طبیعت پر حبیبِ تنگ بر
ناپسند اس کو طمعِ مصلحت کا فرض پر

وہ سمجھتا تھا کہ پانی آگ مل سکتے نہیں
بدگمانی میں گلِ اخلاص کھل سکتے نہیں

وہ نہ تھا گمراہ قومیت کے وہم خام سے
طالبِ بادہ نہ تھا خمخانۂ اصنام سے

ہوں مسلماں اور ہندو ایک قالب ایک گوں
جانتا تھا ایں خیال است و محال است و جنوں

مشورے تھے اپنی بربادی کے بزم غیر میں
دشمنِ جاں تھے صنم اہلِ حرم کے دیر میں

تھی خبر مٹ جائیں گے ہم اور گر تقصیر کی
ہم کو رہنا ہے یہاں تو دھار پر شمشیر کی

قوت بازو سے یک جہتی وطن میں ہو تو ہو
شمع گر گشتہ نہیں ہے انجمن میں ہو تو ہو

خاتمہ فرمایا ہر اک عذرِ بے ہنگام کا
ہند میں پھر بول بالا کر دیا اسلام کا

روشنی پر دفعۃً چھاتی ہے ظلماتِ مہیب
جیسے آجائے اجل عمرِ طبیعی کے قریب

رخصتِ فصلِ بہاراں ہے، اُجڑتا ہے چمن
شمع بجھ جاتی ہے، ہو جاتی ہے برہم انجمن

ختم ہو جاتا ہے یکسر زندگی کا بانکپن
کرتی ہے ویراں خزانِ دق سمن زارِ بدن

غرق کر دیتا ہے بینائی کو ظلمت کا سحاب
چوس لیتا ہے خسوف[۴۹] آبِ عذارِ ماہتاب

بزمِ اطمینان پر زرغنہ کناں غم کا دفور
ساغرِ تقدیر خوش دستِ قضا سے چور چور

جابجا نوبت زناں ہے وقت کا ظالم نقیب
سو بہ سو کُلُّ عَلَیۡهَا فَانٍ کی بانگِ مہیب

۴۹؎ : چاند گرہن،

گل خزاں سے، طنطنہ بیچارگی سے مات ہے،
"کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" کا اثبات ہے

ہے سرِ بالینِ اقبال اب اجل یٰسین خواں
ہیں زبانِ حال سے گویا امارت کے نشاں

"بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے"
گو مگو، گردوں گماں گنبد ہوائی بلبلے

منہ کو آتا ہے کلیجہ ہائے دِلّی کا زوال
ہو بہو غرناطہ و بغداد کا خونیں مآل

ماند ممتازِ زمانہ عکسِ تنویرِ شہاب
روز افزوں عالمِ نورِ جہاں اک خواب

گم ہمایونی زماں، افسانہ دربارِ جلال
عہد زرین و زمانِ خوش عنان وہم خیال

اب کہاں جو زینت و زیبائش اورنگ[ف۵۶] تھے
عود ہندی کا بڑا ہی سازگار آہنگ تھے

ہر طرف آوارہ گردِ ابلق ایام ہے
ہر محل گویا دیارِ مصر کا اہرام ہے

کوئی قلعہ ہے کہ اب رخنہ نہیں دیوار میں
گھر ابابیلوں کے پائیں باغ دشالار میں

خشک ہیں جھرنے شکستہ ہے جھروکوں[ف۵۷] کی قطار
بے نظارہ گل خمیدہ سرو، بے آتش چنار

ہو گیا مٹی مثمن برج کا شفاف رنگ
جنبانِ[ف۵۸] برگ سا بارہ دری کا سنگ سنگ

ف۵ - ۵۶: مغل بادشاہوں اور بیگمات کے ناموں کا التزام ہے۔ ممتاز محل بیگم، شہاب الدین شاہجہاں، نورجہان بیگم، نورالدین جہانگیر، ہمایوں نصیرالدین، جلال الدین اکبر، اورنگ زیب ف۵۷: جھروکۂ درشن: مغل بادشاہ جھروکوں سے صبح رعایا کو درشن دیتے تھے۔ ف۵۸: تمام اطراف سے ہلتا ہوا۔

شیش محلوں کے نمایاں آئینوں پر گرد ہے
روضۂ تاج ایک لاشہ جو سفید و سرد ہے

تخت ہیں تختہ تو گلگشتِ چمن ویرانہ ہے
ہر منبت لعل و گوہر شمع ماتم خانہ ہے

خانۂ مہر آفرینش گارِ ادبار و ظلام
سیر گاہِ عامیاں دیوانہائے خاص و عام

ابر نیساں سے ہوائے مہرگاں[۵۹] کی آفرید
خوشۂ انگور تر سے اشک خونیں کی کشید

تابہ کے اے مرثیہ خواں ماتمِ بخت زبوں
"قالَ اِنّا للہِ اِنّا اِلیہِ راجعون"

خارجی یورش، بدامنی، خانہ جنگی انتشار
رنگ رلیاں۔ جام و مے رامشگری یار و نگار

۵۹: خزاں

باغباں کی بے دلی غارت گرِ ریحان و گل
تنگیِ طبعِ مغاں لذت ربائے جام و مل

بے شعوری بہرِ شاعر باعثِ طامات ہے
بے خیالی نقش گر کو وجہِ صد ہفوات ہے

ہے طبیبِ خام فن خطرہ دل و جاں کے لیے
ایک فتنہ عالمِ کج فہم ایماں کے لیے

رہبرِ ناآشنائے راہ و منزل راہ زن
کُردِ اردُوض٦ کا عریف تنگ جرأت گور کن

گر غبی ہے ذہن بے حسنِ تماشائے کائنات
دل ہے بے احساس تو سوزِ جوانی بے ثبات

گرد ہے گر ذوق ماحولِ گلستاں بے جمال
سرد ہے گر روح تو بے کیف آغوشِ وصال

ض٦: لشکر کا حصہ جو مربع cohort شکل میں شریکِ جنگ ہوتا تھا۔

گر نظر کوتاہ بیں قوسِ قزح بے رنگ ہے
گُل کفِ خاکستر و یاقوت مشتِ سنگ ہے

ہے بصیرت کور تو ہر حسنِ مطلب قوت ہے
ہے سماعت کر تو لب اک آلۂ بے صوت ہے

قوم تن آساں کو کھا جاتی ہیں تن آسانیاں
عافیت کی لذتیں، ساماں کی ارزانیاں

تنگ ہو جاتی ہے قوم سست پر پہنائے دہر
خونِ صالح دوڑتا ہے بن کے شریانوں میں زہر

الحذر از ملت تن کوش و آرام آفریں
الحذر از قوم سہل اندیشہ و گوشہ گزیں

جب یہ بیگانہ ہوا ہے فرض کے احساس سے
بوئے زیست آتی نہیں انسان کے انفاس سے

فرض کا احساس ذہن و قلب کی تابندگی
فرض بنیادِ تمنا، فرض جانِ زندگی

اس کے دم سے ہر کشاکش، کشمکش اور ہاؤ ہو
اس سے کھلتی ہے طبیعت، اس سے تپتا ہی لہو

ہیں اسی سے ہر طرف یہ قہقہے، یہ زمزمے
یہ تگاپو، یہ تگ و دو، یہ جنوں یہ ہمہمے

فرض کا احساس ہو تو زندگانی اک جہاد
سربسر ذوقِ عمل، تنظیم ملت، اتحاد

فرض کا منشا ہے ملت پر مکمل اعتماد
فرض محکم ضبط، محکم عزم، محکم اعتقاد

فرض خالد بنؓ[۶۱] ولید و فرض طارق[۶۲] بن زیاد
فرد کو یعنی عزیز از جان ملت کا مفاد

یہ محمد ابن قاسم[۶۳] ہے، یہ موسیٰ بن[۶۴] نصیر
امر[۶۵] بالمعروف، منکر کی نہی، دعوت بہ خیر

فرض سر تا سر زیاں کارِ خمار خودسری
یہ رسول[۶۶] و حاکم و اللہ کی فرماں بری

فرد کی تقدیر کا تارا ہے ملت کی جبیں
جسم اقبال و نمود ہستیٔ جاں کا امیں

ملتیں جب فرد کی خواہش پہ قرباں ہو گئیں
"دیکھنا[۶۷] اُن بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں"

۴۴

جب بگڑ جائے تو بنتی ہے بڑی دشوار بات
انتظارِ صبح کھینچو ہے قیامت خیز رات

ط۶۳ - ۶۴ جب ان سالارانِ لشکرِ اسلام کو عین فتوحات کے عالم میں معزول کیا گیا تو انہوں نے ذاتی وقار کو قومی مفاد پر ترجیح دے کر حکم کی اطاعت کی، ط۶۵: دعوت الی الخیر، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، ط۶۶ اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم، النساء (۵۹) ط۶۷: غالب،

وارثانِ تختِ عالمگیر سہل انگار تھے
خنجرِ بے قبضہ تھے، ٹوٹی ہوئی تلوار تھے

ان میں بابر کا تہوّر تھا نہ اکبر کی اُمنگ
مانندِ آئینہ کا جوہر، کھا گیا آہن کو زنگ

طبع میں فقدان جوش و عزم و استقلال کا
جسم و جاں کو عارضہ لاحق تھا اضمحلال کا

زندگی جیسے گذرتی ہے کسی معذور کی
کون کہہ سکتا تھا یہ ہیں نسل سے تیمور کی

یہ زمانہ عکسِ بندِ فتنۂ ایام تھا
غارت و عدوان و رستاخیز کا ہنگام تھا

شورشیں امن و اماں سے برسرِ پیکار تھیں
گردشیں صبر و سکوں کے درپئے آزار تھیں

ح۶۸ اورنگ زیب کا جانشین بہادر شاہ اوّل تخت نشینی کے وقت ۶۰ برس کا تھا۔ مشہور ہے کہ وہ دوپہر چڑھے دن کو سوکر اٹھتا تھا۔

تھا سفینہ شاہِ دلّی کا بڑے گرداب میں
تھے دکن میں مرہٹے، منہ زور سکھ پنجاب میں

ہر طرف مصروف کشت و خوں ستمگر بے تکان
بستیاں آتش بداماں، آدمی آتش بجان

اور جو نام خدا صوبوں میں صوبہ دار تھے
سب کے سب خودکام، خود اندیش، خودمختار تھے

بہرِ خانہ بن گئے تھے اہلِ خانہ آپ چور
مر رہے تھے ہڈیوں کے واسطے مردار خور

تھی ہی کیا پونجی مگر اس پر کٹے جاتے تھے وہ
لوٹتے تھے آپ، اوروں سے بھی لٹواتے تھے وہ

بوم کے بدلے اٹھا دیتے تھے یہ طاؤس کو
بیچتے پھرتے تھے ارزاں قوم کے ناموس کو

الغرض ہر سمت از کشمیر و خیبر تا دکن
نفسا نفسی کا تلاطم خیز طوفاں موج زن

تھا یہ عالم جب سمندر پار کے بیوپاریئے
یورپی بہروپیئے، ٹٹ پونجیئے، سرخ آریئے

کر کے غلبہ حیلہ و تزویر و ظلم و جور سے
آگ لینے آئے تھے اور گھر کے مالک ہو گئے

ہم میں بو کر بیج نفرت کے بنے مختار خود
بیج تو بچا کر، رفتہ رفتہ ہو گئے سرکار خود

دم میں آ کر بھائی بھائیوں کے مقابل تن گئے
شیر جب الجھے بہم سر پنچ لومڑ بن گئے

دم بخود ابدال ہر نکتہ قلندر لے اڑا
بلبلوں کی جنگ میں روٹی کو بندر لے اڑا

ان کے گرد و پیش غولِ مردمانِ ذات کوش
سو نظام و ناظم و سردار و خاں حلقہ بگوش

ملت افروشوں پہ جادو وہ چلا افرنگ کا
وائے رتی بھر نہ تھا احساس نام و ننگ کا

حکم کے بندے بہر فرمان بجا کہتے تھے وہ
دوستوں کے سر ہتھیلی پر لئے رہتے تھے وہ

کون سی خدمت تھی جس پر وہ نہیں تیار تھے
سر فروشانِ وطن کے گوشت کے تجار تھے

حق خدمت شرط تھا جس وقت لے لیتے تھے وہ
بے محابا بھائی بہنیں بھینٹ دے دیتے تھے وہ

گر انہیں مبہم اشارہ بھی ولی نعمت کرے
گھر تو کیا ہیں مسجدوں کے دام یہ کر لیں کھرے

ہیں اگر بے دَم، یہاں بے دام بک جاتے ہیں لوگ
ہیں یہاں گُم ہوش گر، ہر گام بک جاتے ہیں لوگ

جو سبک سر ہیں انہیں دہلیزِ جاناں سنگ ہے
موجِ مے کو کسوت مینا قبائے تنگ ہے

ہاں انہی بے ہمتوں میں کوئی بے ہمتا بھی ہے
ڈگمگاتے ہیں سبھی کب، اک قدم جمتا بھی ہے

اڑتا رہتا ہے بہت بے فائدہ بیہم غبار
پھر پسِ پردہ سے ہوتا ہے پدیدار اک سوار

مردے کز غیبے بروں آید، کند کارے تمام[۶۹]
اس بطل، اس مردِ غازی، اس مجاہد پر سلام

بعثتِ موسیٰ جہاں فرعون کا بڑھتا ہے جور
جب خزاں چنتی ہے برگ و بار، پھر آتا ہے بور

ص ۶۹ : نظیری ہے۔

منع کر سکتا نہیں ابرِ سیہ ضو کا نزول
دامنِ صحرا میں بھی دو چار کھل جاتے ہیں پھول

پڑ رہی تھی وقت کے ہاتھوں دل و جاں پر خراش
جھرّیوں میں چہرۂ تاریخ کی تھا ارتعاش

ملک بھر میں دور دورہ عسرت و ادبار کا
گردنِ ہندوستاں پر تھا جُوا اغیار کا

ہر طرف برپا تھا ایسا حشر دار و گیر کا
دست و پا پر تھا شکنجہ تنگ تر زنجیر کا

تھی مسلّط وقت پر اک رات سنگین و طویل
ابتلا کی اس گھڑی میں کچھ زعیمانِ جلیل

سر فروشانہ اٹھے ملت پہ مرنے کے لیے
خشک کھیتی خون سے سیراب کرنے کے لیے

مخلصانہ راہِ حق میں جان دینے کے لیئے
یہ کھویے ڈگمگاتی ناؤ کھیتے کے لیئے

چند بے لوث آبروئے قوم پر ہونے نثار
کچھ نڈر دشمن پہ ہلّہ بولتے مردانہ وار

حیدر و ٹیپو، سراج و قاسم اربابِ ہمم
روحِ اسکندر اٹھائے جن کی جرأت کی قسم

صاحبانِ احتیاط و حزم، اہل رزم و عزم
یاسمینِ سر سبد، قندیلِ ضوافروز بزم

ان کی جرأت زندہ باد، ان کی حمیّت زندہ باد
زندگی وقفِ وطن، یا فی سبیل اللہ جہاد

کم ہے ذکر ان کا مورخ جتنا طولانی کرے
"آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے"

سر پہ ہر کوشش کے ان کی، ڈال دی اپنوں نے خاک
ہائے وہ دامان جیسے دستِ ہوس کر جائے چاک

ہر ارادہ ہم نشینوں نے کیا ناکامیاب
کی ہر اک تدبیر خود ان کے مشیروں نے خراب

ہم جلیسوں نے قدم روکے جو یہ آگے بڑھے
جب یہ بڑھتے ہی گئے تو راہ میں کھودے گڑھے

پاسبانوں نے فصیلِ شہر کر دی پائمال
باغبانوں نے جڑوں سے کاٹ پھینکے خود نہال

دامنوں نے دی ہوا بھڑکی تھی گھر کی آگ کچھ
ڈس گئے ان کو، پلے تھے آستیں میں ناگ کچھ

آئی ماں عاجز سپوتوں کے دمِ شمشیر سے
زور کام آیا نہ زیر اس کو کیا تزویر سے

مادرِ ہندوستاں کا کام کرتے ہیں تمام
ناخلف فرزندگاں ہے ڈوب مرنے کا مقام

زخم کاری ایک میدانِ پلاسی میں دیا
جنگ بکسر میں نہیں رہنے دیا تسمہ لگا

جو اثاثہ تھا وہ سارا نگا پٹم میں لٹ گیا
ہائے کیا مظلوم ہوگا جو گلا خود گھٹ گیا

گھاؤ دل کا تھا یہ بگڑا جس قدر بھرتا گیا
تھا کوئی ناسور جو سارے بدن کو کھا گیا

دل نشیں حربے نہ تھے کیا کیا ستم ایجاد کے
شیر خود چل کے قفس میں آگیا صیاد کے

نوچ کے شاہین اپنے بال و پر چنگال سے
آگیا چنگل میں اربابِ غرض کی چال سے

"واۓ ازبنگال جعفر، واۓ صادق از دکن
ننگ آدم، ننگ ملت، ننگ دیں، ننگِ وطن"

۵

قوم کی جرأت گئی، ہمت گئی، غیرت گئی
دیس کی عظمت مٹی، حرمت لٹی، شوکت گئی

بٹ گئے افراد، یک جہتی فسانہ ہو گئی
ہو کے ملت منتشر نذرِ زمانہ ہو گئی

ڈار کونجوں کی بکھر کے پارہ پارہ ہو گئی
شام برہم صورت بزم ستارہ ہو گئی

چار سو پھرتے تھے بے توجیہہ اربابِ حشم
ہر طرف بے قصد آوارہ غزالان حرم

بن کے تنکے اڑ گئے جیسے صفِ مژگاں کے تیر
سلکِ مروارید کیا ٹوٹی ہوئے موتی حقیر

ؔ : تصرف از اقبال،

اک طرف انگریز اک جانب سکھوں کا زور تھا
جو مسلماں ہند میں زندہ تھا اب در گور تھا

یہ نظر آتا تھا اس کا نام بھی مٹ جائے گا
جب حکومت چھن گئی اسلام بھی مٹ جائے گا

تھی اگرچہ خوب چاندی سالکِ تلبیس کی
جستجو فولاد گوشوں کو تھی مقناطیس کی

ہائے وہ ذرے جو سورج کے لیے بے تاب تھے
ہائے وہ تنکے جو اب بھی کہربا در خواب تھے

میکدہ کھلتا ہے پھر گردش میں آجاتا ہے جام
سُرخ رو ہونے کا کرتی ہے مشیت اہتمام

قوتِ نو کا بنے سرچشمہ سماؤ میار[1]
حریت پیشوں کے جمگھٹ میں ہیں احمد[2] آشکار

---

[1] نواح مردان [2]: سید احمد بریلوی ؒ

بے سروساماں بنا افگندۂ اقلیمِ نو
از پشاور تا ہزارہ منظرِ تنظیمِ نو

مرشد و میر خوانین ایک بے مایہ فقیر
وقت کی لابد ضرورت سے عزائم مستنیر

زندگی کا مدعا دین اور دنیا کا عروج
قوم سے اخراجِ بدعت، خالصہ دَل سے خروج

غیر سے بڑھ کے مگر اپنے ہوئے اس کے حریف
متقی نکلے شقی سے بیش نیت کے کثیف

ہائے جو ملت نہ طے مقصود منزل کر سکی
رہبری کا فیض کب رہبر سے حاصل کر سکی

چند لمحوں کے لیے آتی ہے یہ بھاگی ہوئی
ذہن خوابیدہ طبیعت میں غرض جاگی ہوئی

نام پر مذہب کے بن جاتی ہے گمراہی جنوں
اور امامِ وقت کی امید ہو جاتی ہے خوں

سیّد احمدؒ کا جذب و استقامت مرحبا
سیّد اسماعیلؒ کا شوق و شہامت مرحبا

ہو اگر قربان تو ہو حرمت ایمان پر
فرض کو ترجیح دینا چاہیے یوں جان پر

حبذا جو آئے ملک و قوم کے رستہ میں کام
سوزِ صادق، صدق کامل، دھن مکمل جذب تام

کی نچھاور جاں کہ سچائی پہ چھا جائے نہ کھوٹ
واہ واجاں دادگانِ سرزمین بالاکوٹ

جھلملایا ایک تارا وسعتوں کے سیل میں
ٹمٹمایا اک دیا تاریکیٔ صد لیل میں

اک کرن چمکی طلوعِ صبح کرنے کے لیے
آئی اک تتلی فضا میں رنگ بھرنے کے لیے

اک شرر اٹھا حرارت کی اُمنگ دل میں لیے
آیا اک جگنو ضیائے شمعِ محفل میں لیے

ایک تنکا عزمِ ساحل لے کے طوفاں سے لڑا
ایک ذرّہ شوق میں سورج کی جانب چل پڑا

مختصر سی راہ ویرانوں سے آگے بڑھ گئی
اک ذرا سی آب جو مانندِ دریا چڑھ گئی

مظہرِ فصلِ بہاراں ہو گیا یہ ایک پھول
جب ہوا روشن چراغِ رہ چھٹی نظروں کی دھول

(۶)

یورشِ ظلمت میں شمعِ سیم بر روشن رہی
تند صرصر کی لپیٹ میں بے حذر روشن رہی

اس کے شعلے سے فروزاں ہو گئے ٹھنڈے چراغ
اس کی حدّت سے تپیدہ ہو گئے مردہ دماغ

حریت کی شمع کی حدّت ہے قلب و جاں گداز
حریت کے نور کا ابرق ہے بینائی نواز

حریت کا جوش دب سکتا ہے مٹ سکتا نہیں
یہ مسافر راہ کھو بیٹھے، مگر تھکتا نہیں

پھر سن اٹھارہ سو ستّاون میں ہے نعرہ بلند
واژگوں ہو کر رہے ظالم کا بختِ ارجمند

ہو گیا سر تیز میرٹھ میں دلوں کا التہاب
بن گیا ہر شہر و قریہ گلخن یک انقلاب

جہلم و مردان سے تا لکھنؤ و کان پور
تھا سلحشورانِ آزادی میں کس بل کا وفور

کر کے آتے تھے یہ میدانِ وغا میں زیب تن
خلعت و اعصائے شاہی کی جگہ تیغ و کفن

قتل گہ میں امتحاں تھا ظلم کی شمشیر کا
توڑ کے وحشی چلے حلقہ ہر اک زنجیر کا

لوگ تھے درکار تزئینِ صلیب و دار کو
مل گئے حلاج و عیسیٰ؎١ جعفر؎٢ و اجبار؎٣ کو

کشتنی تھے جو اب ان کی ٹھن گئی جلاد سے
بے کسی بڑھ کر الجھتی ہے سدا بیداد سے

چند پروانے ضیائے حریت پر جان نثار
چند دیوانے کہ لیلائے اجل کے خواستگار

زندگانی کو وطن کے بھینٹ دینے کے لیے
ظالموں سے انتقامِ ظلم لینے کے لیے

؎ خلیفہ ابوالفضل جعفر المقتدر باللہ جس کے عہدِ حکومت میں منصور حلاج کو سولی دی گئی۔

روک گردن کی جگہ تلوار کو تلوار پر
برق کی صورت گرے کاشانۂ اغیار پر

نوچ کے ناخن نے پھینکا رخ سے لعنت کا غلاف
پڑ گیا ہر آہنی دیوارِ زنداں میں شگاف

ہو گیا ایوانِ افرنگی میں برپا زلزلہ
پھر سراج الدین ظفر کے نام کا سکہ چلا

جب اڑا بے خوف آزادی کا پرچم ہر طرف
ہو گئے اس کے تلے غازی اکٹھے صف بہ صف

ہاتھ میں آئی عناں پھر اشہب تقدیر کی
مل گئی پھر مسکراہٹ غنچۂ دلگیر کی

پھر چمک اٹھا ستارہ ہند کے اقبال کا
ختم تھا جیسے زمانہ جبر و استحصال کا

ختم ہو جاتا وہ آئینِ تعدی سو بہ سو
کیفرِ کردار تک آخر پہنچ جاتا عدو

ہاتھ میں آ کر سرا گم ہو گیا تدبیر کا
آدمی بندہ ہے اک حد سے پرے تقدیر کا

سامنے ساحل ابھر کر ہو گیا غرقابِ موج
بن گیا مثلِ زحل نحس آفریدہ نجم اوج

ہو گیا روپوش لہرا کر نظر میں روئے یار
ہو گئی سستا کے چندے باغ سے رخصت بہار

آنکھ جھپکی تھی ذرا، پھر سامنے ویرانہ تھا
"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

سرد ہو کر بھی سوا ہے صبحِ آزادی کی تاب
ہو کے مدھم بھی ہے، دلکش یہ عذار اندر نقاب

عشق کی دیوانگی اب تک حریفِ سنگ ہے
آج تک خونِ شہیداں کا شفق میں رنگ ہے

ہم نوا قصہ نہیں یہ غیر کی بیداد کا
اپنے ہی تیشے سے سر ٹکرا گیا فرہاد کا

دست و بازو آپ اپنی جان کے دشمن ہوئے
اہلِ ہندوستان، ہندوستان کے دشمن ہوئے

ہائے جو دل آپ اپنی موت پر مقتول ہوا
ہائے وہ چہرہ کہ اپنے ناخنوں سے خوں ہوا

آ گئے کچھ لوگ حبِ افرنگ کی تزویر میں
رنگِ ماتم بھر گیا شادی نما تصویر میں

اہلِ اغراض و تملق بر زمین و زر کا دام
یہ وطن افروش، لعنت ان کی روحوں پر مدام

بارِ دیگر ساحر الموت جادو چل گیا
آگ(۵) اب کے وہ لگی گھر میں کہ جو تھا جل گیا

ہم سے بیگانہ ہماری سلطنت کی سرزمین
"آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین"

ملک اپنا سلخ خانہ ہے، کریں قتال خوں
تھا رواں ہر سو ہمارا صورتِ سیلال خوں

حکم حاکم۔ ہر مسلماں کے لیے گردن زنی
اپنے حلقوموں میں پھندہ، اپنے سینوں میں انی

رہگذاروں پر درختوں سے معلّق سر فروش
جسم میں مدفون بندوقوں کی باڑوں کا خروش

ٹکٹکی میں مرغِ بسمل کی طرح مصلوب ہم
دم بہ دم دس بیس اکٹھے ہائے زندہ توپ دم

---

(۵) تصرف از غالب۔

دور آیا تیرہ و تاریک ملت کے لیے
منتخب ہم ہو گئے ہر ایک ذلت کے لیے

ہندو و انگریز اب ہو کے عدو یک جا ہوئے
نو بہ نو فتنے ہمارے واسطے برپا ہوئے

غیر کے معتوب ہم چشموں میں رسوا ہو گئے
کیا تھے ہم اور دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گئے

ہر مسلماں حاکموں کی آنکھ میں اچھا نہ تھا
تخت کیا الٹا کہ اپنا بخت بھی سیدھا نہ تھا

اچھے عہدوں پر گوارا تھے نہ ہم بیوپار میں
دام اٹھتے تھے بڑے سستے ہر اک بازار میں

وہ پژولیدہ، وہ خستہ حال، وہ بدبخت وخوار
کوئی خلاصی تھا ہم میں، کوئی ہم میں پیش کار

اہل تھے پر اہل کاروں کے سوا ہوتے نہ تھے
کام کے تھے پر کہیں بھی تو بجا ہوتے نہ تھے

خانِ ساماں خانسامے اور بھٹیارے بنے
خواجگاں خوجی بہشتی اور گھسیارے بنے

سربلند اب کفش بردار اور کوچہ روب تھے
جن کی پلکوں پر جگہ تھی چشم کا آشوب تھے

صاحبانِ فخر باقی صورتِ خرکار تھے
جو کبھی سرکار ہوتے، حاشیہ بردار تھے

خانہ سازانِ زمانہ ہو گئے خانہ خراب
سرزنش کو رہ گئے یہ وارثانِ انقلاب

زیست کی آسائشیں تھیں ایک دیوانے کا خواب
اب تو ہم تھے اور "اعمالِ شنیعہ کا حساب

بیع اثاثے، ضبط جاگیریں، زمین و زر چھنے
جائیدادیں قرق، نیلام آستانے، گھر چھنے

ریت کی دیوار تھا گویا درِ گردوں جناب
"بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

پردہ داری می کند بر طاق کسریٰ عنکبوت"
کچھ کھنڈر باقی ہیں ایوان و حویلی کا ثبوت

ہر طرح دشمن ہمارا خانہ برانداز تھا
نوکری، کھیتی، تجارت کون سا در باز تھا

روٹھ کر کچھ ایسا ہم سے عہد خوش حالی گیا
جم لیے قسام سے اب کاسۂ خالی گیا

کون تھا ہم میں نہ رہنِ خودداری داد بار تھا
مختصر یہ اقتصادی موت کا ہر وار تھا

اس قدر ہو جب دگرگوں حال انساں کیا کرے
کمتری کا وہ بڑھا احساس جیتے جی مرے

ترک کر دی کاوشِ تعلیم یا محدود کی
یہ بقا کی راہ تھی کچھ وا، سو خود مسدود کی

تھے بڑے نادار اس پر ہو گئے ناکارہ ہم
فکرِ چارہ جوئی سے گذرے کہ ہیں بیچارہ ہم

اس شبِ یلدا پہ ہوتا ہے طلوعِ آفتاب
اس بیابانِ لق و دق پر ابھرتا ہے سحاب

یاس کے دامانِ بے پایاں میں رخشانِ اُمید
غم کے بحرِ بیکراں پر زورقِ ساحل نوید

ہے بہارِ جاں فزا تشریف فرمائے چمن
رونق افزائے نظارہ زینت آرائے چمن

سید احمد خاں نگاہِ دیدۂ بینائے قوم
بہر تشخیص مرض وہ بو علی سینائے قوم

وہ سیہ بختی میں منادِ تجلائے نصیب
اژدہام تیرگی میں صبح صادق کا نقیب

جو ہماری آرزو کو جانتا ہے وہ حبیب
جو ہمارے درد کو پہچانتا ہے وہ طبیب

ایسا نباض اس نے پہچانی علاماتِ مرض
جس نے تن من دھن دیا ملت کو ایسا بے غرض

بے دلی میں جس نے عزم و ہوش کی تلقین کی
دی تشتت میں نویدِ جاں فزا تسکین کی

صاحبِ فکر و بصیرت ۔ قوم کا محسن عظیم
طورِ برقِ علم و سینائے علی گڑھ کا کلیم

فکر ایسا جس کی رفعت میں نہ حائل ہو فلک
وہ بصیرت جس نے مستقبل میں جھانکا دور تک

جس کا احساں آفتابِ روشنِ دارالعلوم
دھوپ میں جس کی نہا کے ہم ہوئے ماہ و نجوم

قوم کو جس نے دکھایا حرّیت کا راستہ
خوب کر کے زیورِ تعلیم سے آراستہ

کر دیا حسنِ تدبر سے اسے بیدار بھی
ابتلا و آزمائش کے لیے تیار بھی

قوم کو اس نے نکالا خواب کے پاتال سے
کر دیا آگاہ آشنائے وطن کی چال سے

ذہن صیقل، قلب روشن، آنکھ کو وا کر دیا
ملک کی رمزِ سیاست سے شناسا کر دیا

کچھ بھی ہو ہندو کی نیت نیک ہو سکتی نہیں
مومنوں کے ساتھ جاتی ایک ہو سکتی نہیں

وہ چمن میں گل کے مستقبل کا ضامن ہو گیا
باغباں گل چیں کے رستے میں کانٹے بو گیا

دائم اس کی روح پر رحمت کی ارزانی رہے
محسنِ ملّت کو حاصل قربِ ربّانی رہے

(۷)

سازگار آئی ہوا تو غنچۂ دل کھل گیا
کارواں یک جا ہوا تو اک حدی خواں مل گیا

ایک لے اٹھی لہو کو آگ فرماتی ہوئی
روح و ذہن و قلبِ یخ بستہ کو گرماتی ہوئی

ایک دانا مستند تھا جس کا فرمایا ہوا
اک حکیم اس کا سخن امت کا سرمایا ہوا

ترجمانِ کُنہِ حسن و شارحِ دیوانِ عشق
"بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق"

قوم کا دل، جس کی دھڑکن نغمہ پردازِ حیات
ہر سخن معجز اثر، ہر بات غمّازِ حیات

جس کے ہونٹوں پر صدائے عظمتِ اسلام تھی
جس کی نظروں میں نوید خوب و خوش فرجام تھی

وقت کی آواز جس میں دل نشیں پیغام تھا
شمعِ وجدانِ نظر، نورِ بصیرت عام تھا

محرمِ ذات و نوا سنجِ گلستانِ خودی
تہنیت گوئے انائے دل، ثنا خوانِ خودی

وہ کہ تھا غواصِ بحرِ بیکرانِ زندگی
سالکِ صالح ضمیرِ کاروانِ زندگی

واقفِ اسرارِ روحِ عصر و تغیر و ثبات
عارفِ نظمِ وراء و ماورائے کائنات

مجتہد اقلیمِ علم و دانش و ایقان کا
وہ مجدد چودھویں ہجری میں ہندوستان کا

پی کے اس پیرِ مغاں سے جامِ صہبائے شعور
روح میں نورِ فراواں، قلب میں بے حد سرور

حاملِ تاثیرِ تریاقِ مئے خود آگاہی
ہو گئے تقدیر گر واندگان بے بسی

سیر چشمی سے مزین، بے نیازِ احتیاج
فقر و درویشی میں بھی ممتاز شاہانہ مزاج

ہائے اس مردِ قلندر کا اثر آور سخن
"تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن"

سست آمادہ جھپٹ میں پنجۂ بے آرزو
بچۂ شاہین کبوتر خو، تفو بر تو تفو

دیکھ کر اس نے زمانے کے ادق حالات کو
وقت کے سانچے میں ڈھالا قوم کی عادات کو

جو یہاں دل باختہ تھے زندگانی سے ملول
جن کے روز و شب تھے ان کے واسطے ربطِ فضول

ان کے احیا کے لیے نعرہ کہ ہے ام الکتاب
انقلابِ روح کا سامان، روحِ انقلاب

اس نے مجبورِ سفر دیکھا یہاں انگریز کو
موڑ مڑتے صاف پایا وقت کے شبدیز کو

پہلوؤں میں اس نے گاڑا اور بھی مہمیز کو
اور بھی چھلکا دیا پیمانۂ لبریز کو

قلب میں بھر کر تمنا، آنکھ میں دھر کر کرن
کر دیا ملت کو آزادی کی رہ پر گامزن

اہتمام افسانے کی خاطر کیا عنوان کا
قوم کو بخشا تصور ملک پاکستان کا

اک وطن جاری ہو جس میں دینِ فطرت کے اصول
ہو حکومت کی بنا " قال اللہ و قال الرسولؐ "

فکر مستقبل بھی تھی گو نغمہ سازِ حال تھا
یہ حدی خوانِ کاروانِ قوم کا اقبال تھا

صبح ساں بستانِ ملت میں ہوا نغمہ سرا
نیند کے ماتوں کو گہری نیند سے چونکا دیا

کی حقیقت بیں گرد و پیش اب چشمانِ کور
مضمحل اعصاب کو بخشا یقین و شوق و زور

آشنائے گرم و سرد اس نے کیا احساسِ دل
بارِ دیگر اہتمامِ نفخ بہر آب و گل

کی ہمیں تنبیہ یہ اب بھی اگر سنبھلے نہیں
ہم تو کیا باقی نہ ہو گی داستاں اپنی کہیں

اژدہائے تہذیبِ نے کیں بیشتر قومیں فنا
فکر میں ہم کو نگل جانے کی تھا یہ اژدھا

ملک میں مدت سے تھا ہندو سیاست کو فروغ
راستبازی کے مقابل تھا جمال آگیں دروغ

دور دورہ تھا وطن میں مشرب سالوس کا
شور غالب تھا اذاں پر سنکھ اور ناقوس کا

دلقؔ پوش اک اپنی حکمت میں بڑا مشہور تھا
اس کا فرمایا ہوا اس دور کا منشور تھا

ص۶۷: لنگوٹی بند، گاندھی جی،

میٹنا کچھ یوں مسلمان اور ہندو کی تمیز
دیں ہو قومیت زدہ، ملت سیاست کی کنیز

نعرہ زن ہندوستان ہندوستانی کے لیے
امتحان سخت اپنی سخت جانی کے لیے

ہائے کیا حربے تھے جو ہم پر روا ہوتے رہے
مشورے ہم کو مٹانے کے سدا ہوتے رہے

مسئلہ یہ تھا کہ ضم ہو جائیں یا قائم رہیں
رفتہ رفتہ ہم فنا ہو جائیں یا دائم رہیں

ہو چکی تھی فاش لیکن دشمنوں کی چال اب
کر نہ سکتے تھے ہمیں ظلم و ریا پامال اب

قوم کو بحران میں اپنی بقا کا پاس تھا
کیا تقاضا تھا زمانے کا بڑا احساس تھا

سامنے منزل تھی لیکن تھا سفر اس تک گراں
کارواں موجود تھا لیکن نہ میر کارواں

راہ کے بارے میں وارد ہو رہا تھا اختلاف
جستجو اب تھی کرے کوئی مسلط دھند صاف

مدعی تھے رہبری کے نیک نیت، اعتراف
فہم و دانش کا خدایا پھیر فرمانا معاف

غیب سے آخر بروں آیا وہ مرد کامگار
تھا ہمیں جس کا زمانہ در زمانہ انتظار

مدتوں کے بعد اک مردِ مجاھد کا ظہور
صاحبِ شمعِ فراست، حاملِ نورِ شعور

زیرک و بافہم، میدانِ سیاست کا سوار
واقفِ طبعِ رفیقاں، دشمنوں سے ہوشیار

ہمسروں میں بیّن و بے مثل ملت کا دماغ
کوئی افقی بھی نہ تھا جس کا حریف ایسا چراغ

صاف تقدیر ملل کے باب میں جس کی نظر
زور و زر کا سخت ناممکن طبیعت پر اثر

روشنی جس سے ضمیروں کو ملی وہ باضمیر
جس کی کرنیں بن کے پھیلے ہم وہ خورشید منیر

عزم سے جس کے چٹانیں ٹوٹ کر ہموار تھیں
سامنے جس کے حریفوں کی ضدیں بے کار تھیں

جس نے کی تردید ہر بے مغز استدلال کی
طرح رکھ دی خوبصورت حال و استقبال کی

پھر بجا فرمائیے ملت کے شکستہ دست و پای
پھر توانا کر دیئے اپنے زماں خوردہ قوای

ہوگئی جو مرجع ملت وہ باتمکین ذات
جس کے دم سے صبح پھوٹی، چھٹ گئی تاریک رات

محترم، بابائے ملت، قائدِ اعظم جناح
جس نے پاکستاں کا فرمایا بالآخر افتتاح

جس نے دلوایا عدو سے حق حکومت کا ہمیں
جس نے واپس لے دیا ورثہ ریاست کا ہمیں

ہوگیا رخصت ہمیں کر کے وہ اربابِ مراد
قائدِ اعظم، رفیع و زندہ و پائندہ باد

ہائے وہ گل جس کے دم سے عطر زا تھے بزم و باغ
ہائے وہ شعلہ منور ہوگئے جس سے دماغ

ہائے وہ قلزم جو ہر قطرے کو موتی کر گیا
ہائے وہ سورج کہ سب نظروں میں کرنیں بھر گیا

ہائے وہ جس سے سکوں کو شورشِ طوفاں ملی
ہائے وہ جس سے تنِ بے زندگی کو جاں ملی

ہائے وہ جس نے دلِ مرحوم کو زندہ کیا
ہائے جس نے چشمِ ظلمت زاں کو تابندہ کیا

سرد شریانوں میں گرم و تند پارہ بھر دیا
منجمد موجوں کو اک مواج قلزم کر دیا

حق تعالیٰ اس کے مرقد کو سدا روشن رکھے
رحمتوں کا اس کی روحِ پاک پر دامن رکھے

(۸)

مات کھا کر صاحبِ تدبیر سے اہلِ وطن
درپئے تخریبِ پاکستاں ہوئے باظلم و فن

آتشِ کینہ بھڑک اٹھی ہمیشہ سے زیاد
عرض و طول ہند میں برپا ہوئے خونیں فساد

لوٹ، بلوہ، غدر، فتنہ، شور، شر، غارت، قتال
سخت بدبودار تھا باسی کڑھی کا یہ اُبال

چھینٹ تھا جیسے کڑاہی میں یہ احساسِ شکست
چاہتے تھے ہم کو آزادی میں بھی بے پا و دست

تنگ ظرفی میں بساطِ عقل برہم ہو گئی
تیل کم تھا، لو دیئے کی آپ مدہم ہو گئی

دیکھ کر ہم کو تشنج تھا بڑا اعصاب میں
زخم کھا کر اژدھا آیا تھا پیچ و تاب میں

تار تار اس طرح کچھ ملبوسِ انساں ہو گیا
یہ درندہ صاف مادر زاد عریاں ہو گیا

آدمیت مر گئی، قدرِ قرابت مٹ گئی
شرم رخصت ہو گئی، حسِّ نجابت مٹ گئی

یوں بدلتا تھا شعور اب عصبیت کی آگ میں
ہر تعلق دشمنی میں، ہر لگاؤ لاگ میں

دوستوں کا دوست، ہمسائے کا ہمسایا نہ تھا
آدمی اب باپ بیٹا اور ماں جایا نہ تھا

سوزِ داغِ نامرادی کو چھپانے کے لیے
ارضِ پاکستاں کو ہستی سے مٹانے کے لیے

ہر اہنسا کا پجاری، آشتی کا دیوتا
پیکرِ انساں میں اک عفریتِ خون آشام تھا

تھا کمر بستہ ہمیں نابود کرنے کے لیے
نور کو پھونکوں سے گرد و دود کرنے کے لیے

ہائے گاندھی جی کے چیلوں کی ستم ارزانیاں
دیش کے دھرماتماؤں کی اجل سامانیاں

---

(۱) عدمِ تشدد کا مسلک۔

بھیڑیئے بھیڑوں کے، پروانوں کے حق میں سوسمار
سنگ دل، جلاد خو، سفاک، ظالم، خون خوار

رات دن جنتا بھیمانہ ستم انگیز تھی
پیش پا افتادہ ایٹیلا و چنگیز تھی

وہ ستم جن کی نہیں تاریخ میں پیدا نظیر
وہ تشدد جس سے ترساں دیدۂ گردونِ پیر

ظلم وہ جن کی زمانوں میں نہیں ملتی مثال
حملہ آور شیر خواروں پر ہوئے بھارت کے لال

چھین کے ماؤں سے دیواروں میں پٹخاتے انہیں
ہوم[1] روشن کر کے انگاروں میں چٹخاتے انہیں

چیر دیتے تھے کبھی ٹانگیں پکڑ کر ہائے ہائے
رحمِ مادر ہی میں کرتے تھے کبھی جیو ہتیا[2]ئے

---

[1] الاؤ جو مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے جلاتے ہیں [2] جان سے مارنا

لڑکے بالوں کے شہابی جسم پامال وخراب
صاف نیزوں پر چڑھا کے کر دیئے زندہ کباب

لڑکیوں کے نرم اندا موں کا حال اندوہ ناک
چھاتیاں بھالوں سے چھلنی، پیٹ کرپانوں سے چاک

کرکے آری سے بدن دو لخت از سر تا بہ ناف
ہڈیوں سے نوچ ڈالے کھال کے نازک غلاف

گوش و بینی، دست و بازو کاٹتے پھرتے تھے وہ
زندہ لاشوں سے کنوؤں کو پاٹتے پھرتے تھے وہ

بوٹیوں کو نوچتے تھے داغ دیتے تھے بدن
استخواں براں، گلوزن، جاں فگن، اعضا شکن

یہ قصائی قتل کرتے بے بسوں کو گھیر گھیر
جا بہ جا کشتوں کے پشتے، تہ بہ تہ لاشوں کے ڈھیر

موج زن کرتے ہوئے دریا لہو کے بے دریغ
عورتیں، بچے، جواں، بوڑھے، اپاہج نذرِ تیغ

رسیوں میں باندھ کرلاتے ہوئے بے بس شکار
مائیں، بہنیں، بیٹیاں، عریاں قطار اندر قطار

آسماں ٹوٹے، زمیں پھٹ جائے یہ ظلم اے خدا
اس طرح رسوا حرم کوچہ بہ کوچہ، جا بہ جا

جن کے دامن پر نماز حور ہوتی تھی ادا
جن کے سایوں کو فرشتوں نے کبھی دیکھا نہ تھا

بانوانِ شہر عصمت، خلد کی شہزادیاں
عائشہؓ زہرہؓ سکینہؓ جن کی مائیں دادیاں

یوں پھریں بے ستر، بازاروں میں یوں نیلام ہوں
گندگی زادہ، ہوس راندہ لبوں کے جام ہوں

نسلِ انسانی کی حرمت اس طرح بے آبرو
عفت و دوشیزگی کا چاک دامن چار سو

یوں بہائے ہائے قابیل اُمّ حوّا کا لہو
مریم و سا وتری و جون[۸۱] و زلیخا کندہ مو

گاہ بازاروں میں دوشیزاؤں کے عریاں جلوس
گاہ بہر صد لعیناں ایک با عصمت عروس

قمریوں کے واسطے شاہین خفاش و کلنگ
مچھلیوں کے حق میں غوکانِ عفونت بر نہنگ

اف نجس دل کے مظاہر، پوچ فطرت کے سماں
یہ ہوس رانی، ہوس کاری کے منظر الاماں

پیتر پرتاب[۸۲] اور شیوا[۸۳] کا سیہ اطوار ہے
رشی مینوں کا پجاری جنس کا بیمار ہے

---

[۸۱]: جون آف آرک [۸۲، ۸۳]: رانا پرتاب، سیواجی، ان کی جرأت کا ایک جوہر یہ تھا کہ بچوں پر ہاتھ نہ اٹھاتے تھے،

مورکھوں کے لب پر ان پُرکھوں[84] کی جے جے کار ہے
اور طوفانِ ہوسناکی سرِ بازار ہے

آبِ گنگا میں گناہوں کی سیاہی گھولتے
عصمتوں کو لوٹ کر یہ دھرم کی جے بولتے

جنس کی آسودگی سے پُن کماتے یہ مہنت
دروپدی ننگی تھی اور کوروں[85] مناتے تھے بسنت

استریوں[86] سے یدھ[87] میں رن بیری دکھاتے راجپوت[88]
اپنے باپوں کے جری ناموں پہ دھبہ یہ کپوت[89]

اس طرف پیدا اگر طغیانِ صد پردہ دری
اس طرف برپا ہے طوفانِ صد غارت گری

حملہ زن، یورش کناں چند اک نہتوں پر ہزار
ایک چھوٹے سے محلّے پر بھری بستی کا وار

۸۴؎ اسلاف ۸۵؎: جب دروپدی کو سرِ دربار برہنہ کیا گیا تو کوروں نے بساطِ عشرت جمائے تھے۔ ۸۶؎ خواتین ۸۷؎: لڑائی، ۸۸؎: بہادری ۸۹؎: ناخلف،

پھونکتے تھے راکشس ہر گھر کو گھر والوں کے ساتھ
یا انہیں بن باس دیتے دل پہ سو چھالوں کے ساتھ

بے سروساماں، برہنہ پا، اجڑتے روپ میں
کالے کوسوں پا پیادہ بارش آندھی دھوپ میں

کارواں در کارواں پنجاب اور بنگال سے
کیا کہیں پہنچے وطن میں بے وطن کس حال سے

جاں بچالائے مہاجر ہند کے ہر شہر سے
اس مہا[ف۹] دیو تعصب کے قتال و قہر سے

وہم تھا بھارت کو پاکستان فنا ہو جائے گا
ان کروڑوں بے گھروں کے فکر میں کھو جائے گا

ظلم کے بارے میں جو منطق ہے وہ مجہول ہے
حیدرآباد اس کے استبداد کا مقتول ہے

ف۹: ہندوؤں میں تباہی کا دیوتا۔ رودرا، شنکر مہادیو

دیوِ استعمار کا پابستۂ زنجیر ہے
جوناگڑھ، منگرل، مناوادر یا کشمیر ہے

جس جگہ مسلم ہے ظالم برسرِ پیکار ہے
تاختت کی رفتار مدہم ہے نہ کم یلغار ہے

ہے یہ ہندو سامراجی جون اک چنگیز کی
صورتِ تازہ تملک بازی انگریز کی

ہے تنک ظرف اس شرابی کو زیادہ چڑھ گئی
منہ لگی آقاؤں کے لونڈی تو حد سے بڑھ گئی

آریائی کبر میں لتھڑا ہوا ہندو مزاج
نشأۂ ثانی عناد و بغض کا یہ رام راج

مردہ باد اے ہندو استبداد، ظالم رام راج
غارت و برباد یہ انگریز خصلت سامراج

جس میں سیتا ئیں نہ ہوں محفوظ وہ راون نژاد
رام چندر جی کو کردے قتل ایسا نامراد

اس کے ہاتھوں دل لہو ہے اور سینہ داغ ہے
یہ خزاں ایسی تبہ کن دشمن ہر باغ ہے

پیشقی، بدخواہ یہ اپنا عدوئے مال وجان
کب ہے اس کے جارحانہ عزم وسازش سے اماں

کینہ ور بالطبع یہ روزِ ازل سے کینہ ور
کم نظر روزِ ابد تک جو رہے گا کم نظر

تنگدل جس کو نہیں ہمسائیگی کے حق کا پاس
سنگدل جس پہ روا ہے بھائیوں کا پوست ماس

یہ بد اندیشِ رفیقاں، ہم جلیسوں کا حریف
قول اور وعدہ سے روگرداں، طبیعت کا کثیف

اس کو یہ اصرار ہے مٹ جائے پاکستان کا نام
چاہیئے اس کے مقابل متحد ہوں خاص و عام

درپئے آزارِ ملت ہے سدا خانہ خراب
یہ چکائے ظلمہائے حال و ماضی کا حساب

سونت لے تلوار ہر غازی، یہ تلخیصِ کلام
اپنا نعرہ، انتقام و انتقام و انتقام

(۹)

پشاور

(۱)

اے پشاور آستانِ بابِ پاکستان و ہند
تو دبستاں ہے برائے مردمِ ہشیار و رند

تجھ میں سو عنوان شرحِ زندگانی کے لیے
سینکڑوں کردار پیدا اک کہانی کے لیے

آنکھ کو ہر جلوہ عہدِ رفتہ کا آئینہ ہے
فکر کو ہر ذرہ بزمِ دفترِ پارینہ ہے

ہوں بصارت کے لیے کیسے ہی ویرانے یہاں
ہیں بصیرت کو حقیقت زاد افسانے یہاں

یہ فضا دامن کشا چشمِ بصیرت کے لیے
یہ ہوا زمزمہ زناں ذوقِ سماعت کے لیے

یہ خلا گورِ صریرِ کلکِ صد مضمون ہے
سینۂ خاموش میں سحرِ نوا مدفون ہے

بنتی اور مٹتی رہیں ہر روز تصویریں یہاں
بگڑی اور سنوری کئی قوموں کی تقدیریں یہاں

دامنِ دل کو کرشموں کا اسی جا کھینچنا
اشک و خوں سے مزرعِ ہندوستاں کو سینچنا

ذہن میں کیا کیا نظاروں کی فراوانی یہاں
دیدنی ہے فکر و اندیشہ کی حیرانی یہاں

ایک ہی ٹہنی کے ہیں دو پھول ماضی اور حال
بسکہ ہم رشتہ ہیں ایام ترقی و زوال

تھا کئی اقوام کے مابین اک راہِ رواں
پھر بھی ہم تک آئی ہے مربوط تیری داستاں

ذرہ ذرہ میں ہجومِ صد تجلی تاب ہیں
سلسلہ در سلسلہ زرین و سیمیں باب ہیں

جھانکیے کچھ دورِ ماضی کا دریچہ کھول کے
دیکھیے موتی کئی مٹی میں یہاں کی رول کے

اس جگہ انساں اگر چشمِ تصور وا کرے
زندگی ہنگامہ ہائے نو بہ نو برپا کرے

حجرۂ دیروز میں پڑھیے یہ دیرینہ کتاب
دیکھیے ایام کے چہرے سے سرکا کے نقاب

جامِ جم اس جا نہ یاں قندیلِ سینا چاہیے
یہ تماشا گاہ وہ ہے چشمِ بینا چاہیے

ماورائے کوہ و دریا کب کوئی آگاہ تھا
قافلوں کو درۂ خیبر چراغِ راہ تھا

اولیں منزل مسافر کی، سکوں افزا مقام
اس جگہ آ کر تھما تھا آریوں کا اژدہام

وِرد کرتے وید کا سمہت ترگ[۲] کے راگ میں
پھونکتے ہر پاپ اور پن کو پوتر آگ میں

چند فطرت کے مظاہر کا بھجن گاتے ہوئے
اٹھ کے وسطِ ایشیا سے ہند پر چھاتے ہوئے

اس وطن میں اک نئی تہذیب کے بانی ہیں یہ
اصل بھارت باسیوں کے دشمنِ جانی ہیں یہ

قومِ غارت گر دراوڑ نسل کی صیاد ہے
سندھ کی تہذیب ان کے ہاتھ سے برباد ہے

ذات پات ان کا وطیرہ، قائلِ پست و بلند
آدمی یا تو زبون و خوار ہے یا ارجمند

پھر قدم آئے یلانِ لشکرِ ایران کے
اور پھر گذرے قشونِ قاہرہ یونان کے

ص۱: سمہت = سنگیت، وید کا پہلا حصہ جو بھجنوں اور دعاؤں پر مشتمل ہے ص۲: ترگ کے معنی نظم کے ہیں۔

شاملِ اقلیمِ کسرانِ عجم کچھ روز تھا
فاتحِ مقدونیہ کو بھی خراج اندوز تھا

یہ دیار اک عرصہ رہنِ گردشِ ایام بھی
شاک و اہلِ باختر کی رہگذارِ عام بھی

تاخت پرداز اس پہ اب تھے پہلو اب پارتھی
ہر گھڑی تازہ تگ و تاز اور گیر و دار تھی

جب "پرش پور" راجدھانی بن گیا زیرِ کشان
تب ہوا اس میں طلوعِ عالمِ امن و امان

وہ زمانہ جب علوم و فن کی افزائش ہوئی
زندگی مصروفِ صد تزئین و آسائش ہوئی

ذہنِ مشرق ربط فرما تھا فنِ اغیار سے
ہو گیا اثر رنگ مانی یہ فن گندھارا سے

نقش سب کے سب ہوئے زائل کہاں اس دور کے
شاہ کی ڈھیری میں اب تک ہیں نشاں اس دور کے

یہ زمانہ جب بیابانِ فنا میں کھو گیا
شمع یکدم گل ہوئی، یکسر اندھیرا ہو گیا

آ گئے سامان صد غارت لیے غولانِ ہُن
خوں فشاں، آتش فگن، بیداد گر، ویران کن

بار بار اس رہ سے گذرے غازیانِ غزنوی
ہو گیا تسلیم خود دشمن کا ہر دستِ قوی

اس کے زیرِ کفش[۳۵] سونے اور چاندی کے صنم
اس کے زیر پا سرانِ راجگانِ باحشم

اس کے آگے پست ہمت جاٹ، کائر راجپوت
فتح اس کی برتر و اعلیٰ تمدن کا ثبوت

---

۳۵ البیرونی رقمطراز ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے سومنات کے بت کے ایک ٹکڑے کو جامع مسجد غزنی کے دروازے پر ڈال دیا تھا جس سے لوگ آتے جاتے جوتے صاف کرتے تھے۔

سب بلی، بلوان، رانے، رائے ٹھاکر سورما
لے اڑی ذرات کی مانند غزنی کی ہوا

پھر ورود اس شہر میں اک مردِ باتمکین کا
فاتحِ ہندوستان سلطان شہاب الدین کا

بہمن و جمشید جس کے حاشیہ بردار بھی
صاحبِ فن منصرم، کشورکشا سالار بھی!

دیکھئے جاہ و جلال ایک ایک خوشہ چین کا
یلدز[۵۴]، التتمش، قباچہ اور قطب الدین کا

پرچمِ اسلام کی نظارہ بیں چشمِ فلک
گوڑ و لکھنوتی[۵۵] سے اجمیر و اچ و لاہور تک

آیا کچھ دور اس طرف چنگیز کا سیلِ تتار
ماوراء النہر[۵۶] کو کرکے خراب و خستہ و خوار

۵۵: بنگال میں ضلع [illegible] کے آس پاس کا علاقہ

۵۴: سلطان محمد غوری کے غلام جو الگ الگ صوبوں کے مالک و مختار یا بادشاہ بنے

اک خدائی قہر، لیکن ٹل گیا تدبیر سے
بچ گیا ہند ایک خونیں فتنۂ شمشیر سے

حملہ آور پے بہ پے پھر بھی رہے منگول یاں
سلطنت کھیلی ہمیشہ جن کے خوں سے ہولیاں

بوڑھے بلبن نے وطن پر کر دیا بیٹا نثار
ہائے شہزادہ محمد نیک خو، عالی شعار

جنگ جو سلطاں علاؤ الدین کے خونی حروب
تیرتے پھرتے تھے سر اپنے لہو میں ڈوب ڈوب

بلبن و خلجی نے کب بڑھنے دیا سیلِ بلا
گر بڑھا بھی، گردِ ملتان و سمانہ سے ٹلا

کر سکے تغلق نہ سرد اس آتشِ سیال کو
کھا گیا جیسے گہن نورِ مہِ اقبال کو

ہو گیا شیشہ زمانے کی رگڑ سے سخت سنگ
اور اس بستی کو گذرا روندتا تیمور لنگ

جب بھی اس نے فرض پر ترجیح دی ہے جان کو
پیس ڈالا آسیائے وقت نے انسان کو

فاتحانہ پھر ہوئی داخل یہاں بابر کی فوج
ہو گیا آغاز آخر عہد صد معراج و اوج

تھا بہت خوش حال اس زریں زمانے میں یہ شہر
مدتوں گذرا نہ اس جانب کوئی طوفانِ قہر

جھڑ گیا جب ٹوٹ کے قبضہ مغل تلوار کا
ہو گیا یہ شہر کشتہ نادری یلغار کا

اس طرف سے شاہ ابدالی کے دھاوے پے بہ پے
بولتے تھے خالصہ اور جاٹ جس غازی کی جے

جس جری نے مرہٹوں کا حال ابتر کر دیا
رن میں پتہ پانی، پت؎ کو دھول کنکر کر دیا

چہرہ دستوں کا لہو پانی سے ارزاں ہوگیا
خوابِ بالادستیٔ؎ پونا پریشاں ہوگیا

تا بہ کے یہ آمد و شد، یہ کسے معلوم ہے
وقت کا آغاز بھی انجام بھی موہوم ہے

مدتوں سے اس طرف اب کوئی ہنگامہ نہیں
اک خموشی ہے خروشِ خنجر و خامہ نہیں

دیر سے یہ رہگذارِ رہروِ عالی نہیں
کوئی غوری، غزنوی، بابر اور ابدالی نہیں

دیدہ و دل فرشِ رہ خیبر سے تا لاہور خاک
پھر کوئی غازی بٹھائے دشمنوں کے دل پہ دھاک

؎ : غزنت ؎ بالاجی ثانی، پانی پت کی جنگ میں مرہٹوں کی شکست کے صدمے

پھر کوئی بھارت پہ لہرائے علم اسلام کا
کوئی اٹھ کے موڑ دے رخ گردش ایام کا

---

(۲)

اے پشاور سرخی و دیباچہ تاریخ ہند
ہیں ترے دم سے مزیّن تذکراتِ گنگ و سند

کوچہ و بازار و ایوان و گلستان و فصیل
موج زن ان میں رہی ہے زندگی کی سلسبیل

یہ نمایاں آئینے تیرے در و دیوار کے
یہ مرقع ہائے گوناں گوں قدیم آثار کے

ہر قدم پر منتشر تاریخ کے اوراق یہ
بام و فرش و غرفہ و محراب و سقف و طاق یہ
شہ کی ڈھیری، پنج تیرتھ، گور کھٹری، یادگار[۹]
گھنٹہ گھر، مسجد مہابت خان[۱۰] اور بالا حصار

۹ چوک یادگار، انگریزوں نے تعمیر کی۔ ۱۰ عہد عالمگیر مہابت خان صوبیدار کابل نے بنائی۔

یہ وزیر[1] و شاہ کے باغات فردوس التزام
مرقدِ رحمان بابا، مرجع کل خاص و عام

کچھ پرانے اور کچھ تازہ دیئے انجم فشاں
اک کہانی ہے ادھوری ایک پوری داستاں

نقش ہندو، کوئی یاد عہدِ عالمگیر ہے
خالصہ کی اور کوئی انگریز کی تعمیر ہے

حال میزانِ مضیٔ دیروز کا پیمانہ ہے
ہر شکست و ریخت اک افسانہ در افسانہ ہے

ہم کو آثار الصنا دید آج سنگ میل ہیں
مہر فرد اشارعِ امروز پر قندیل ہیں

سو نمایاں ہیں جو صورت ایک پنہاں ہو گئی
اور ابھری ہے تمنا، جب یہ ارماں ہو گئی

---

[1] وزیر باغ، شاہی باغ

دیکھتی ہے آنکھ جو بینائی میں باریک ہے
یہ پشاور ذہن و دل کی اک نئی تحریک ہے

اس کی ہستی داعئ فکر و عمل ہو جائے گی
چھب نکھر آئے گی جب یہ آج کل ہو جائے گی

ہیں عوام اب حکمراں، جمہور ہیں مسند نشیں
اس کی کرّ و فر کے ضامن، اس کی عظمت کے امیں

از سرِ نو کر رہے ہیں باغ کی ترتیب ہم
ہر خرابہ پر بنا آرا ابھر ترکیب ہم

یہ نئے انداز کے گھر، یہ وسیع و صاف باغ
یہ کھلے بازار، یہ دو رویہ برقابی چراغ

حرفلستاں، درس گاہیں، فن کدے، دار الشفا
رقبۂ فصل فراواں، چشمۂ آبِ صفا

ایک جمہوری ریاست کے حسین دالان و در
اک نئی ملت کے نخلِ کامرانی کے ثمر

درۂ خیبر میں تازہ ساختہ دارالعلوم[12]
روز افزوں تشنگانِ علم و دانش کا ہجوم

یہ ہماری نسل کے پر صدق مقصد پر گواہ!
یہ علوم عقلی و نقلی کی بین نشرگاہ!

دے گی جابر کو مساوات و اخوت کا سبق
بے محابا عام فرمائے گی انسانوں کا حق

یہ منارہ ہادئ نور و نظر ہو جائے گا
حدِ وسطِ ایشیا تک روشنی پھیلائے گا

صد بہاراں آفریدہ تازہ نرگس کی نگاہ
و ذِتہ صد کشت ویراں سبزۂ برگ و گیاہ

---

[12] پشاور یونیورسٹی،

ہر گلِ نو میں خزاں خوردہ گلوں کی باس ہے
ہر سویرا گمشدہ تنویر کا عکاس ہے

ہے ضیائے مہرِ مرحوم انجم و مہ کا جمال
خونِ صد انگور سے ہے شیشۂ مے میں ابال

جو چمک مدہم ہوئی، دل ان سے عالمتاب ہے
جو پسینہ تف ہوا، اس سے جبیں شاداب ہے

گھٹ گئے جو سانس ان سے زندگی کو ہے دوام
آبرو ہیں میکدے کی جو کبھی ٹوٹے تھے جام

ہر سفینہ بحر آب جس کی بساطِ رزم ہے
کتنے ہی غرقاب بیڑوں کا سراپا عزم ہے

ہر جوانی سو بڑھاپوں کی نئی تمثیل ہے
ہر ارادہ حسرتوں کی آخری تکمیل ہے

ہر حسیں تصویر کتنے ہی خطوں کا اجتماع!
ہر پرانے نقش کی مرہونِ منت اختراع!

نغمۂ بلبل ہے مدھم سر ازل کی چیخ کا
گل سراپردہ ہے سارے باغ کی تاریخ کا

لابدی حلقہ ہے لمحہ وقت کی زنجیر میں
جزو لاینفک کرن خورشید کی تنویر میں

آدمی، ذرہ، صدف، تارہ، کرن یا پھول ہے
قطعِ راہِ ارتقا میں مستقل مشغول ہے

کل پشاور اور تھا، کل اور ہوگا یہ دیار!
وقت کے دامن پہ ہوگی ثبت امروزہ بہار!

حال جب ماضی کی گہری گود میں سو جائے گا
اور بھی اس کو مورخ خوبصورت پائے گا

ٹیکسلا

سرزمینِ ٹیکسلا تیرے مضافاتِ حسیں
ہیں کئی رفتہ زمانوں کی جلالت کے امیں

کتنی تہذیبوں کے مدفن، کتنی قوموں کے مزار
دیوتاؤں کی سمادھیں، مذہبوں کی یادگار

یہ کھنڈر اک سلطنت کے بعد دیگر پر گواہ
جاتے اور تشریف لاتے بیشتر گیتی پناہ

یاں سریر آرا ہوئے ہوں گے کئی کشور کشا
زینتِ اکلیل و اورنگ آب بخشانِ لوا

تاجدارانِ فریدوں فرّ و کیخسرو جلال
ماہ رتبہ، مہر عظمت، جم نگیں، قیصر مثال

صد ثریا آستاں، گردوں حشم، کیواں جناب
پادشاہانِ معظم، مقتدر، عزّت مآب

تھا زمانہ در زمانہ نقش زا تاریخ گر
یہ پرانا شہر جس پر تھی زمانے کی نظر

تاخت اس پر خسرو[1] و دارا کے لشکر کی کبھی
یورش اس پر فاتحِ دوراں سکندر کی کبھی

اس جگہ ہو گی کہیں ملت فروش امبھی[2] کی راکھ
جس نے اپنی آبرو کی بھینٹ دی جنتا کی ساکھ

شاک کا ہلّہ کبھی حملہ کناں تھے پارتھی
اہل بختر کی دوش، یاوَن[3] کی یلغار تھی

قبضہ یوچی کا، کشانوں کا سہانا راج تھا
تند خو، ہیطال[4] غولوں سے کبھی تاراج تھا

---

[1]: کیخسرو دارا اول جنہوں نے گندھارا فتح کرکے ایران میں شامل کیا۔ [2] ٹیکسلا کا راجہ جو نہ صرف مطیع ہوا بلکہ پورس کے خلاف سکندر کو سپاہی بھی دیئے۔
[3] یونانی شہزادے جو کابل اور مضافات پر کافی عرصہ حکمران رہے۔ [4] سفید ہن (EpThalites)

صوبۂ تخت شہانِ موریہ تھے یہ نواح
جن کی حکمت تھی حکومت میں رعایا کی فلاح

چکرورتی چندرگپت، آشترگھاٹا بندوسار
پرجا کا راجا اشوکِ نیک دل زاہد شعار

اس سنہرے دور نے دی اور اس کو آب تاب
بن گیا ٹیکشیلا ہر راجدھانی کا جواب

دیکھتا ہے آج بھی انسان کیسا دم کو سادھ
دھرم راجے کا سٹوپا اور کنالا کی سمادھ

عشق سوتیلی کا بیٹے سے یہیں منسوب ہے
جھوٹ یا سچ داستان گو کو بڑا مرغوب ہے

---

(۱) شہنشاہ (۲) دشمنوں کو تہ تیغ کرنے والا لقب تھا، (۳) ٹیکسلا کا پرانا نام۔
(۴) اشوک کی بیوی تشیارکشتیا جو سوتیلے بیٹے کنال کی محبت میں گرفتار ہوئی، مشہور قصہ ہے۔

فکر فرمانے کو اس جا بیسیوں مضمون ہیں
نینوا[9]، ار، اصطخر[10] کی عظمتیں مدفون ہیں

ہاں یہی سنسان خطے کل تھے انساں خیز شہر
تھی انہی ویراں کدوں میں زندگی کی لہر بہر

سنگریزوں کے یہ تودے، یہ گل وخارہ کے ڈھیر
از کنارِ تومرہ[11] تا دامن ہتیال[12] و بھیر[13]

ابن آدم کے کمال و اوج کے عکاس ہیں
نقش گو مدہم ہیں لیکن مظہر احساس ہیں

کتنے غم آزاد، دل آرام لوگوں کی دلیل
دور تک پھیلے ہوئے بازار و ایوان و فصیل

یہ دکانیں، یہ مکاں، یہ تال، یہ مندر، یہ چاہ
دیکھتی ہے ان پہ ہنگامے تصور کی نگاہ

ح۹ وادیٔ عراق میں قدیم تہذیب کے مراکز ح۱۰ ایران میں قدیم عظیم شہر ح۱۱ ندی جو ٹیکسلا کے بیچ سے بہتی ہے ح۱۲ ایک چھوٹا سلسلۂ کوہ جو پنڈی کی طرف چلا گیا ہے۔ ح۱۳: ٹیلہ ہے۔

ہے بڑے خوش حال ماضی کا دفینہ یہ دیار
ارتقائے زندگی زینہ بہ زینہ یہ دیار

ہے نمایاں آج بھی کچھ شاہ راہوں کے نشان
یہ محل آباد تھا یہ ملتوں کے درمیاں

دیکھیے چشم تصور سے گذرتے کارواں
پاٹلی پتر سے تا نیکوسیا[۱۶۴] و بامیاں

چیں سے ریشم، میڈیا[۱۶۵] سے گج کے بت لاتے ہوئے
کوئی رت ہو، بے تکاں آتے ہوئے جاتے ہوئے

ہر طرف اجناس کی افراط ہن کی ریل پیل
لین دین، آمد برآمد، دان پن کی ریل پیل

نیلم و لعل و زمرد کی فراوانی یہاں
نقرئی سکے، روپہلے ہار، جستی چوڑیاں

---

[۱۶۴] افغانستان میں تھے [۱۶۵] ایران کا ایک حصہ

ہیں کھلونے اور آلات طرب ہر قسم کے
شوخ ملبوسات، سامانِ نگارش جسم کے

پارچات گرم و سرد، اسباب تزئین و نشاط
زندگی جن سے مسلّم اک فراغت کی بساط

دھات اور مٹی کے برتن سونے چاندی کے ظروف
ساخت سے ثابت ہے اک اک چیز کی فن کا وقوف

کوئی شے ایسی نہیں جو اس جگہ نایاب ہے
چپہ چپہ یہ زمیں زرخیز ہے شاداب ہے

اس جگہ عبرت کے کچھ اندوہ گیں منظر بھی ہیں
پھول بھی، کانٹے بھی ہیں، یاقوت بھی پتھر بھی ہیں

ہے زیاں بھی اک حقیقت لاکھ ہو سودائے سود
بسکہ قائم ہے برابر نور و ظلمت کا وجود

پنتھ ہیں کیناؤں کے نیلام ہوتے ہیں یہاں
اُس پرائے دھن کے سستے دام ہوتے ہیں یہاں

چاہتی ہے جب ہوس ساماں کنار و بوس کو
بیچتے ہیں بے نوا ماں باپ خود ناموس کو

اف پتی ورتا[۱۲] میں وہ دھوا کی چیتا جلتی ہوئی
لاش اک دخمہ پہ کوئی بے کفن گلتی ہوئی

سادھوؤں کے ٹھٹ تپسیاؤں میں کتنے ڈھنگ سے
کچھ الف ننگے، سراسر غیر نام و ننگ سے

بال اور ناخن بڑھائے کچھ جٹا دھاری کہیں
کچھ کہیں سنیاس دھارے، کچھ برہمچاری کہیں

بالمیکی، بھگوتی[۱۳]، جینی، بدھی، ویدانتی
گیان میں ڈھونڈھے یہ مکتی، کرم میں وہ شانتی

۱۲: خدمت شوہر کا جذبہ ۱۳: بھگوت گیتا کے ماننے والے مراد ہیں۔

کوئی نوورتی[18]، کوئی پرورتی[19] کی شوبھا میں گم
کوئی مستِ دہر، کوئی ذات کی دبدا میں گم

وہ اپاشنگ[20]، سنگھ کے بھکشو، ہنایانی یہاں
اشٹہ[21] مرگ کی سناتے اولیں بانی یہاں

یہ مہایانی[22]، ترقی یافتہ مت میں جدا
بدھ جنہیں مظہر سے بڑھ کر ہوگیا عینِ خدا

بت بناتے، پوجتے سکھیہ[23] منی، کے ہر طرف
جوق جوق انبوہ در انبوہ، دل دل صف بہ صف

اس زمین کے ذرے ذرے میں نیا افسانہ ہے
یہ فنونِ خوبصورت کا عجائب خانہ ہے

---

[18] دواقیت دنیا سے گریز [19] اصولِ تلذذ، بار بعبش کوشش کہ عالم دوبارہ نیست
[20] بدھ مت کے پیرو جو سنگھی نہیں، سنگھ مذہبی ادارہ ہے، اس سے متعلقین بھکشو کہلاتے ہیں [21]: بدھ مت کے آٹھ اصول [22]: بدھ مت کے پرانے مسلک ہنایان سے بغاوت کرنے والے [23] مہاتما بدھ کا لقب،

ہے یہی دادی جنم بھومی فن گندھار کی
اولین تصویر مشرق و غرب کے افکار کی

دیو مالا پر فن یونان کی لگتی ہے چھاپ
بنسری کی لے پہ ہوتا ہے میوزوں[۲۴] کا الاپ

دیش کے رشیوں کو ملتی ہے بدیشی آب تاب
نقش نازک، خط سبک، سنگین رخ پر التہاب

وہ تراشیدہ مناظر، زندگی کو رشک آئے
ایک اک ٹکڑا وہ پتھر کا کہ دل میں گھر بنائے

ہیں سٹوکو[۲۵] اور خارا ہیں بدھستا[۲۶] کے نقوش
شوخ دل افروز پہلو، شانت آسن سخت کوش

ص۲۴: علوم کی یونانی دیویاں MUSES ص۲۵ STUCCO
ص۲۶ ٹیکسلا کی نواحی بستیاں،

بدھ کے ہونٹوں پر ملائم مسکراہٹ کی نمو
شانتی آدرش دیتی ہے کوئی ہو روبرو

سرسُکھ[۲۷]، دسرکپ، بھمالا، جولیاں، جنڈیال میں
ہر جگہ لپٹا ہوا ماضی ردائے حال میں

یہ سٹوپے، یہ مہنتوں کی گپھائیں جابجا
اور ہر ڈیوٹ کے اندر دیوتا کا بت سجا

یہ کھلے دالان، یہ خارا کے آیونی[۲۸] ستون
پڑھ رہے ہیں آیۂ اِنَّا اِلَیہِ رٰاجِعُون

اڑتی پھرتی ہے یہاں ان کتنے ہی راجوں کی خاک
جن کے عزم و رزم کی بیٹھی کبھی دنیا میں دھاک

بربریت برہمنوں کی ہوگیا قصہ تمام
ان درندوں کے مشاغل، آگ، غارت قتلِ عام

---

۲۷ ٹیکسلا کی نواحی بستیاں ۲۸ یونانی فن تعمیر Ionic

قتل کرتے، خوں بہاتے، مارتے آتے ہیں وہ
پھونک کر سب بستیاں برباد کر جاتے ہیں وہ

پردۂ ماضی کا پڑ جاتا ہے ہر شے پر کفن
خاکِ نسیاں ڈال دیتا ہے یہاں چرخِ کہن

کارناموں کو سلف کے ڈھانپ کر بڑھتا ہے وقت
کب کوئی بستی مٹا کے مرثیہ پڑھتا ہے وقت

ملتے ہیں تخریب سے ڈانڈے ہر اک تعمیر کے
آدمی ہے بے حیثیت سامنے تقدیر کے

آدمی بے چارگی میں بھی مگر ہے پُر وقار
دب تو جاتا ہے مگر مرتا نہیں اس کا شرار

اک چراغِ کُشتہ سے کرتا ہے یہ روشن چراغ
اک بہارِ رفتہ کی بو سے یہ مہکاتا ہے باغ

مستعد ہے نامساعد اور کٹھن حالات میں
دھوپ میں سائے کا موجد نور کا ظلمات میں

عزم سے زندہ ہے یہ ہمت سے بالا ہے سدا
اس نے مر مر کے جہاں میں نام اچھالا ہے سدا

کوئی عالم ہو مگر حسِّ عمل بیدار ہے
ہر قدم پر وقت سے آمادۂ پیکار ہے

ہے اسی مرحوم وادی میں یہ پھر گرمِ عمل
آج قبضہ میں ہے اس کے گر نہیں قدرت میں کل

پھر یہاں یہ کھول کر بیٹھا زمانے کی کتاب
داستانِ ارتقا کا لکھ رہا ہے اور باب

دشت و صحرا میں بنائے شہر کی تدبیر ہے
اک خرابے میں نیا ہنگامۂ تعمیر ہے

آدمی سالار ہے اور کارواں ہے زندگی
اس کے دم سے جاوداں پیہم دواں ہے زندگی

چل رہا ہے ارتقا اپنی روش وقت اپنی راہ
ٹیکسلا کے بعد کر سیرِ حسن ابدال و واہ

ادب ادب کے لئے ہے کہ زندگی کے لئے
مری بیاض اٹھا لو تو فیصلہ ہو جائے

شوکت واسطی کا
زیر طبع کلام

فصل شعاع ——— نظمیں

سنگ و سر ——— غزلیں

لخت لخت جگر ——— سانیٹ، گیت، رباعیاں، قطعے

گذشتہ تیس سال کے واقعات کا عکس پیش کرتی ہیں۔

عظیم پبلشنگ ہاؤس پشاور